# ارمغانِ امان اللہ خان

مرتبین

پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت ، پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین

ادارہ علومِ اسلامیہ ، پنجاب یونیورسٹی
قائدِ اعظم کیمپس لاہور

ارمغانِ امان اللہ خان
مرتبین ❖ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت ، پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کے

مرحوم اساتذہ کی یاد میں چھٹا ہدیہ علمی

# ارمغان

## امان اللہ خانؒ

مرتبین
پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت
پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین

Institute of Islamic Studies
ادارہ علوم اسلامیہ
UNIVERSITY OF THE PUNJAB

ادارہ علوم اسلامیہ
شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور

جملہ حقوق محفوظ
اشاعت: اکتوبر، ۲۰۲۳ء/ربیع الثانی، ۱۴۴۵ھ
ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

**Armughan Aman Ullah Khan**
**A Commemoration Volume**
**in honour of**
**Prof. Dr. Aman Ullah Khan**

**Compiled by:**
**Prof. Dr. Jamila Shaukat**
**Prof. Dr. Shahida Parveen**

October, 2023/ Rabi' al-Thani, 1445 Hijri
Institute of Islamic Studies
University of the Punjab, Lahore

# مجلسِ ارمغان

| | |
|---|---|
| ☆ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت (پروفیسر ایمریطس ادارہ علومِ اسلامیہ) | کنوینر |
| ☆ پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین (ڈائریکٹر ادارہ علومِ اسلامیہ) | رُکن |
| ☆ پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر (صدرِ شعبہ اُردو) | " |
| ☆ پروفیسر ڈاکٹر عاصم نعیم (ادارہ علومِ اسلامیہ) | " |
| ☆ ڈاکٹر حافظ عثمان احمد (ادارہ علومِ اسلامیہ) | " |

☆☆☆☆☆

## پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خانؒ

(۲۵اپریل،۱۹۳۳ء — ۱۷فروری، ۲۰۰۶ء)

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ اپنے دفتر میں

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر امان اللہ خان قومی ترانے کے خالق
جناب حفیظ جالندھری کے ساتھ

دائیں طرف سے دوسرے نمبر پر پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان اور
تیسرے نمبر پر جناب حکیم محمد سعید

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان بانی ہمدرد فاؤنڈیشن، جناب حکیم محمد سعید کے ساتھ

# حُسنِ ترتیب


| | | | |
|---|---|---|---|
| ☆ | تعارفی خاکہ | پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت | ۱۱ |
| ☆ | تقدیم | پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت | ۱۵ |
| ☆ | اداریہ | پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی | ۱۷ |
| ☆ | حرفِ سپاس | پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین | ۱۹ |


## ..... تذکرہ پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خانؒ .....


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم | پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ بشارت | ۲۱ |
| ۲۔ | ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم۔ علومِ اسلامیہ کے ایک بیدار مغز استاد | پروفیسر مُستنیر احمد علوی | ۲۷ |
| ۳۔ | ڈاکٹر امان اللہ خانؒ اور میرا شعورِ تاریخ | جناب راحت شاہین | ۳۱ |
| ۴۔ | میرے محسن۔ پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خانؒ | جناب ڈاکٹر اعجاز احمد | ۳۳ |
| ۵۔ | ڈاکٹر امان اللہ خانؒ۔ ایک مثبت شخصیت | جناب راحت عباس ظہیر ڈولہ | ۳۷ |
| ۶۔ | Prof. Dr. Aman Ullah Khan – Family Memoirs | جناب سلمان احمد خان ضیغم | ۴۳ |


## ..... اُردو مقالات .....


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | میثاقِ مدینہ کی اہمیت وافادیت | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۴۵ |
| ۲۔ | اسلامی ثقافت کے بنیادی عوامل | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۶۱ |
| ۳۔ | حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ ﷺ کے مقامِ تدفین ہونے پر شبہات کا ناقدانہ جائزہ | ڈاکٹر حافظ عثمان احمد | ۷۷ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۴۔ | عہدِ مغلیہ کے تعلیمی اقدامات و انصرامات۔ تاریخی جائزہ | ڈاکٹر یاسر فاروق | ۹۹ |
| ۵۔ | سر سید احمد خان۔ تشکیل شخصیت کے بنیادی عناصر | پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر | ۱۳۵ |


## .....انگریزی مقالات.....


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۶۔ | ‘Ilm Al-Hadith and Its Influence on Historiography | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۱ |
| ۷۔ | Early Muslim Historiography | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۱۱ |
| ۸۔ | Al-Waqidi – An Assessment of His Position as an Historian | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۲۵ |
| ۹۔ | Ahmad B. Dawud Abu Hanifa Al-Dinawari (d.c. 282 A.H./895 A.D.) | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۳۷ |
| ۱۰۔ | Al-Baladhari and His Contribution to Muslim History | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۴۳ |
| ۱۱۔ | A Critical Appraisal of Al-Tabari’s Contribution to Muslim Historiography | ڈاکٹر امان اللہ خان | ۵۹ |
| ۱۲۔ | The Legacy of Holy Prophet Muhammad (PBUH) and its Impact on the Development of Islamic Civilization – A Historical Perspective | پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ بشارت | ۶۹ |
| ۱۳۔ | Managers’ Responsibilities in Stress Prevention at Workplace: An Islamic Perspective | جناب سلمان احمد خان ضیغم / جناب گلزار احمد | ۸۳ |


☆☆☆☆☆

# تعارفی خاکہ

| | |
|---|---|
| ☆ نام | امان اللہ خانؒ |
| ☆ والد کا نام | محمد عثمان خانؒ |
| ☆ پیدائش | ۲۵/اپریل، ۱۹۳۳ء |
| ☆ جائے پیدائش | کھاریاں |
| **تعلیم** | |
| ☆ ایم۔اے علوم اسلامیہ | ۱۹۵۸ء |
| ☆ ایم۔اے تاریخ | ۱۹۵۹ء |
| ☆ پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ | ۱۹۷۱ء |
| ☆ تخصص | تاریخ اسلام، جدید معاشرتی، سیاسی و معاشی افکار |
| **عملی زندگی** | شادی شدہ |
| **اولاد** | چار صاحبزادے اور ایک بیٹی<br>رضوان اللہ خان، سلمان احمد خان ضیغم،<br>عمران احمد خان، عرفان اللہ خان اور صدف خان |

| | |
|---|---|
| **ممبر شپ** | پنجاب یونیورسٹی، کالجز اور دیگر جامعات کی بورڈ آف سٹڈیز، مختلف کمیٹیوں اور باڈیز کے ممبر رہے۔ |
| **سیمینار و کانفرنس** | ملکی و بین الاقوامی سطح پر مختلف جامعات میں منعقد سیمینارز، کانفرنسز وغیرہ میں مقالات پیش کیے اور صدارت کی۔ |
| **ذمہ داریاں** | درج ذیل اعلیٰ اداروں میں تدریسی و تنظیمی فرائض سرانجام دیئے: |

- ☆ لیکچرر، شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۳ء۔۱۹۷۰ء
- ☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۸ء
- ☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۸ء۔۱۹۸۲ء
- ☆ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۲ء۔۱۹۹۲ء
- ☆ چیئرمین، شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۵ء۔۱۹۷۶ء، ۱۹۸۱ء۔۱۹۸۸ء
- ☆ وارڈن، مجیٹھیا ہال، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۴ء۔۱۹۷۵ء

| | |
|---|---|
| **تدریسی تجربہ** | تدریس و تحقیق اور تنظیمی امور کا تجربہ تیس (۳۰) سال |
| **مضامین تخصص** | تاریخ اسلام، اسلام اور جدید سیاسی، معاشرتی اور |

| | |
|---|---|
| | معاشی افکار |
| **تحقیقی مقالات کی نگرانی اور ممتحن** | ایم اے کی سطح پر لکھے گئے تحقیقی مقالات اور پی ایچ ڈی کی سطح پر شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، میں بیس (۲۰) سے زیادہ مقالات بزبان اردو، انگلش اور عربی کی نگرانی کی۔ مختلف ملکی و غیر ملکی جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی مقالات کے بطور ممتحن فرائض سرانجام دیئے۔ |
| **تحقیقی سرگرمیاں** | اردو، انگریزی اور عربی زبان میں قومی اور بین الاقوامی مجلّات میں متعدد علمی و تحقیقی مقالات شائع ہوئے۔ |
| **وفات** | ۱۷ / فروری ۲۰۰۶ء |

★★★★★

# تقدیم

قارئین گرامی قدر! ارمغانِ علمی کے سلسلے کا چھٹا ہدیہ **"ارمغان امان اللہ خانؒ"** حاضر خدمت ہے۔ بلاشبہ اس شمارے کے آپ تک پہنچنے میں دیر ہوئی اس کی متعدد وجوہ اسباب ہیں لیکن اس وقت آپ کے سامنے اپنی سستی اور کمزوری کا اعتراف ہے۔

دیگر مطبوعہ ارمغان کے برعکس موجود "ارمغان" کے لیے صاحبان تحقیق و قلم سے علمی و تحقیقی مقالات کے حصول کے لیے متعدد بار یاد دہانی کرانے کے باوجود ملنے کی رفتار نسبتاً سست رہی۔ میرے نزدیک اس کا ایک سبب آپ سب کا دیگر علمی مجلات کے لیے اپنے گراں مایہ تحقیق کی فراہمی کی طرف زیادہ توجہ ہو گی۔ جس کا بظاہر سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات محترم "ارمغان" کو **ایچ ای سی** سند یافتہ نہیں سمجھتے لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر آپ حضرات کا تعاون نہ ملے تو اس کام کا آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

بہر کیف مقالات کی وصولی کے انتظار میں طباعت ٹلتی رہی اس کے تلافی یوں کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صاحب ارمغان کے بعض ذاتی مطبوعہ تحقیقی مقالات کو شامل کرنا پڑا۔

ازاں بعد سب سے بڑی رکاوٹ مالی وسائل کی عدم دستیابی ہے یعنی یونیورسٹی سے بھی اس مد میں رقم وصول کرنا ناممکن ہو گیا تو یہ مشورہ دیا گیا کہ اس کو اَن لائن (online) پیش کیا جائے۔ ربِ رحیم و کریم کی خصوصی مدد اور گذشتہ سالوں کی رقم کی کچھ بچت کی بدولت موجودہ ارمغان کو محدود تعداد میں شائع کرنے کا مشورہ ہوا۔ آپ حضرات سے التماس ہے کہ اَن لائن مطالعہ کریں اور اپنے وقیع تاثرات سے نوازیں۔

ہم اہلِ قلم حضرات کے ممنون ہیں کہ جنھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود زیرِ نظر **ارمغان** کے لیے وقیع مضامین تحریر کیے۔ مجلس ادارت خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ بشارت اور مرحوم امان اللہ خان کے صاحبزادے جناب سلمان احمد خان ضیغم کے ممنون ہے کہ جنھوں نے اپنا ایک علمی مضمون اور خاندانی یاداشتیں بھی عطا کیں۔

ہم پروفیسر مستنیر احمد علوی، راحت شاہین، ڈاکٹر اعجاز احمد، راحت عباس ظہیر ڈولہ،

ڈاکٹر یاسر فاروق، پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر اور ڈاکٹر عثمان احمد کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست کو پذیرائی بخشی اور اپنے رشحات قلم سے نوازا۔

کتب **ارمغان** کے سلسلے کی آئندہ کڑی ان شاء اللہ **ارمغان علامہ اسد** ہو گی۔ **ممکن** ہے کہ اکثر قارئین اس معروف نام اور ہمارے ادارے کے قیام کے لیے ان کی مساعی سے ناواقف ہوں۔ علامہ محمد اسد کی شخصیت عالمی سطح پر جانی جاتی ہے۔ جامعہ پنجاب سے ان کا تعلق یہ ہے کہ وہ بالکل ابتدا میں اس کے شعبہ اسلامیات سے وابستہ رہے۔ **قرآن حکیم** اور **صحیح بخاری کے تراجم**، **اے روڈ ٹو مکہ اسلام ایٹ کراس روڈ**، **مسلم ریاست** وغیرہ پر ان کی کتب علمی دنیا میں معروف ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس نئی مملکت کے لیے قانون سازی اور اس مقصد کے لیے عالمی سطح کے تجربات سے آگاہی کی خاطر **انٹر نیشنل اسلامک کلوکیم**(**Colloquium**) کے انعقاد کے سلسلے میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اقوام متحدہ میں بھی وطن عزیز کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیا۔ اہل علم ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کی روشنی میں اپنے مقالات کے لیے موضوعات کا تعین کر سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پہلے کی طرح اس بار بھی ہمیں آپ سب کا علمی و قلمی تعاون حاصل رہے گا۔

راقمہ، ڈین فیکلٹی علومِ اسلامیہ پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی اور ڈائریکٹر ادارہ علومِ اسلامیہ پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین کی ممنون ہے کہ انہوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود ارمغان کے لیے اپنے گراں قدر خیالات و تاثرات سے نوازا۔

عزیزم ڈاکٹر عثمان احمد کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے ہر قدم پر تعاون کیا۔ مجلس ادارت عزیزم سرفراز احمد (سینئر کے پی او، فیکلٹی علومِ اسلامیہ) کی شکر گزار ہے کہ انہوں نے موصولہ مقالات کو محنت اور تندہی سے یکساں فارمیٹ میں ڈھالا اور آپ کے استفادے کے لیے پیش کیا۔

**ڈاکٹر جمیلہ شوکت**

پروفیسر ایمریطس / کنوینر ارمغانِ علمی

# اداریہ

ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم ان چند افراد میں سے تھے جو اپنی صلاحیتوں اور محنت کی بنیاد پر ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے کامیابیاں سمیٹتے ہیں۔ جنہیں عرفِ عام میں سیلف میڈ (self made) کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امان اللہ خان محض چند سالوں میں تمام تعلیمی اور تکنیکی مراحل طے کرتے ہوئے ادارہ علومِ اسلامیہ کے چیئرمین کی منصب عالی پر فائز ہوئے۔ آپ ایک بہترین منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے استاد بھی تھے۔ ان کا خاص میدان سیرت و تاریخ اور علومِ اسلامیہ کی سماجی وسیاسی جہات تھا۔ آپ کے لیکچرز طلبہ و سامعین کی علمی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ فن تدریس اور قوت اظہار وبیان میں اپنی مثال آپ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ معمول کی تدریس کے علاوہ مختلف قومی اور سرکاری اداروں میں ڈاکٹر صاحب کے لیکچرز تسلسل کے ساتھ منعقد ہوا کرتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر ان کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے اور میرے ایم اے کے تحقیقی مقالہ کی نگرانی بھی محترم ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب نے فرمائی۔ اس سلسلے میں بھی ان کے اندازِ نگرانی سے بہت سی باتیں سیکھنے کا موقع ملا۔

ایک عرصہ سے ادارہ علومِ اسلامیہ نے اپنے سابق اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک شاندار علمی اشاعتی سلسلے کا آغاز کر رکھا ہے۔ **ارمغانِ علمی** کے نام سے اس قابل تحسین کاوش کے تسلسل اور کامیابی کا سہرا ادارہ کی محترم استاذہ پروفیسر (امریطس) ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کے سر ہے جن کی سرپرستی اور مسلسل عملی کوشش سے پانچ اساتذہ کرام کے نام سے منسوب **ارمغانِ علمی** اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں اور علمی وادبی حلقوں سے داد وصول کر چکے ہیں۔ اس سلسلے کا چھٹا **ارمغانِ علمی** آپ کے ہاتھوں میں ہے جو استاد محترم ڈاکٹر امان اللہ خان (مرحوم) کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب محترم کے تعارف کے علاوہ مختلف شاگردوں کے تاثرات اور ڈاکٹر صاحب کے خاص علمی میدان سیرت و تاریخ سے متعلق مختلف

النوع تحقیقی مضامین شامل ہیں۔

ادارہ علومِ اسلامیہ اس علمی کاوش پر مبارکباد کا مستحق ہے اور جملہ معاونین کے علاوہ محترمہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ خصوصی شکریے کی بھی مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

**پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی**
ڈین کلیہ علومِ اسلامیہ

# حرفِ سپاس

فلسفہ تاریخ پر لکھنے والوں نے تاریخ کی حقیقت کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھا ہے۔ بعض کے نزدیک تاریخ بڑے بڑے واقعات کی روداد کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک کسی خطے یا کسی زمانے میں تہذیب و ثقافت اور نظریات و افکار کو تبدیل و تحویل سے گزار دینے والے احوال و اسباب کا نام تاریخ ہے۔ بعض کے نزدیک قوموں کے عروج و زوال کی مکمل داستاں تاریخ کہلاتی ہے۔ یہ سب تعریفات اپنی جگہ درست ہو سکتی ہیں لیکن اگر تاریخ کو عظیم افراد اور ان کی مؤثر مساعی کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس میں زیادہ معنویت محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادارہ علومِ اسلامیہ نے اپنی عظیم تاریخ کو زندہ رکھنے کے لیے، اس کی تشکیل و تعمیر اور علمی ترقی میں کارفرما رجال کار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ایک علمی سلسلے کا آغاز کیا ہے جس کو **ارمغان علمی** کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی چھٹی کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ڈاکٹر امان اللہ مرحوم سے مجھے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ ان کی تدریسی و علمی مہارت کی شہادت دینا میرے لیے اعزاز ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ اور ان کے معاونین قابلِ صد مبارک باد ہیں کہ وہ ارمغان علمی کی اس روایت کے لیے تسلسل کے ساتھ محنت کرتے ہیں۔ تحقیقی مقالات و مضامین کا حصول ایک مشکل اور مشقت انگیز کام ہے۔ ادارہ علومِ اسلامیہ یہ سلسلہ دیگر جامعات کے شعبہ جات کے لیے بھی تحریک و تحریض کار کا باعث بنے گا، ان شاءاللہ۔

**پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ پروین**

ڈائریکٹر، ادارہ علومِ اسلامیہ

# تذکرہ

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خانؒ

*ڈاکٹر طاہرہ بشارت

# پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خانؒ کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے علم کی آبیاری کی، بھرپور اور مخلص کوششوں سے ادارے کو پروان چڑھایا، اپنے بحرِ علمی سے اپنے طلبہ کو اس طرح سیراب کیا کہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ اپنے علم، عمل، خُلق اور جذبہ کے ایسے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔ وہ لوگ حقیقی معنوں میں قابلِ رشک ہوتے ہیں جن کی زندگی دوسروں کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوتی ہے۔ میرے لیے میرے استادِ محترم میرے ممدوح محترم پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب مرحوم اِنھی خوش نصیبوں میں سے ایک تھے۔ اگر میں یہ کہوں تو کچھ غلط نہ ہو گا کہ:

مت سہل اِنھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

* پروفیسر اینڈ چیئرپرسن شعبہ اسلامی فکر و تہذیب، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور

محترمہ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ نے جب مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بارے میں کچھ قلم بند کرنے کو کہاتو مجھے احساس ہوا کہ اُن کی شفقت و رہنمائی کا قرض اتارنے کا نادر موقع آن پہنچا ہے اور میں اُن احساسات و جذبات سے مالامال ہوں جن کو عقیدت کے الفاظ میں ڈھالنا کوئی مشکل کام نہ ہو گا، مگر جب قلم تھاماتو شاگرد کو حقِ استاد نبھانا مشکل ہو گیا۔

ڈاکٹر امان اللہ صاحب کا شمار ان عظیم اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے علم کی آبیاری کی، بھرپور اور مخلص کوششوں سے ادارے کو پروان چڑھایا، اپنے بحرِ علمی سے اپنے طلباء کو اس طرح سیراب کیا کہ وہ بھی اپنی ذات میں گوہر علم کے تیز رو دریا بن گئے، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ اپنے علم عمل خلق اور جذبہ کے ایسے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے نشانِ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم ومغفور سے میرا پہلا تعارف تب ہوا جب میں نے ایم اے اسلامیات کے سال اول میں داخلہ لیا۔ مظفر گڑھ جیسے چھوٹے شہر سے لاہور کی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں داخلہ میرے لیے دلی آرزو کی تکمیل کا پُر مسرت موقعہ تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب اور دیگر معزز اور محترم اساتذہ کرام سے بھرپور علمی استفادے کے مواقع میسر آنے کا شوق گویا پاؤں زمین پر نہ ٹکنے کے محاورے کی عملی شکل سے کچھ کم نہ تھا

ڈاکٹر صاحب نے 1981 میں شعبہ کے چیئر مین کی ذمہ داری سنبھالی، مگر ان کی یہ انتظامی ذمہ داری ان کی تدریس کے آڑے نہیں آتی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں پاکستان کا نظام اس تباہی اور بربادی سے ابھی بہت دور تھا جس کا ہم آج ہر طرف مشاہدہ کر رہے ہیں، اگرچہ 1995 میں ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ اسماعیل میں تین یونیورسٹیوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر پرانی یونیورسٹیوں میں اہل علم کی علم سے وابستگی، تعلیمی ڈسپلن، میرٹ کی پابندی اور طلباء میں علم کی طلب و جستجو ہنوز قائم و دائم تھی۔ مجموعی طور پر یونیورسٹیوں میں علمی ماحول کا غلبہ تھا۔ اس وقت لاہور میں ایک ہی یونیورسٹی تھی اور وہ تھی پنجاب یونیورسٹی، تمام کالجز پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ ملحق تھے۔ پرائیویٹ یونیورسٹیوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا، اگرچہ پرائیویٹ سکول اور کالجز کھلنے شروع ہو گئے تھے، مگر ابھی ابتدائی شکل میں اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف تھے، ڈیپارٹمنٹ میں ایک ہی ڈگری دی

جاتی تھی، اور وہ تھی ایم اے کی۔ ڈیپارٹمنٹ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے رجسٹریشن ہوتی تھی، رجسٹرڈ سکالر اپنا مقالہ اپنے سپروائزر کی رہنمائی میں لکھ کر جمع کرا دیتے، اور رپورٹ آنے کے بعد دفاع میں کامیاب ہونے پر ان کو ڈگری عطا کر دی جاتی تھی، مگر ایسا خال خال ہی ہوتا تھا، کیونکہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کی آج کے دور کی طرح ضرورت تھی اور نہ طلباء و سکالرز میں اس کا رجحان تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب ایک بہترین استاد تھے انہیں اپنے مضمون پر مکمل گرفت تھی، انہیں پڑھانے کا طریقہ و سلیقہ آتا تھا۔ وہ اپنی بات کہنے اور سمجھانے کا گر جانتے تھے۔ تدریس اور تحقیق دونوں ہی میدانوں میں وہ نہ صرف ماہر تھے بلکہ ان کی گرفت بہت ہی مضبوط تھی۔ بات کی تہہ تک پہنچنا اور زیرِ بحث موضوع کے مختلف پہلو واضح کرتے چلے جانے پر ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کی کلاس میں طالب علم کبھی بور نہیں ہوتا تھا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ پورا پیریڈ پڑھنے کے بعد تھکاوٹ محسوس کرنے کے باوجود طالب علم کی بشاشت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیکچر معلومات کا خزینہ اور سلاست و روانی کا گنجینہ ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت کی جاذبیت اور رعب مل کر کلاس کے ماحول کو پر کشش بناتے تھے۔ طالبات کے ساتھ ان کا برتاؤ اگرچہ نہایت مشفقانہ ہوتا تھا، تاہم ہمارے اندر ان کی عزت کے ساتھ ساتھ رعب کا تاثر زیادہ گہرا تھا، انہیں سوال کے جواب دینے میں کبھی تامل نہیں ہوتا تھا، وہ سوال سنتے اور اس کا جواب دیتے اور طالب علم کو خوب مطمئن کرتے اور پھر مزید غور و فکر کرنے پر ابھارتے۔

ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1983ء میں ان کی رہنمائی میں پی ایچ-ڈی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، تو پہلے انھوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا، اور جب میں نے بصد اصرار کہا کہ میں اس دشوار گزار گھاٹی میں قدم رکھنے کے لیے تیار ہوں تو جواباً آج بھی ان کا ناصحانہ جملہ میرے کانوں میں گونجتا ہے جسے میں نے اس وقت پورے اعتماد یقین اور عزم مصمم کے ساتھ پلے باندھتے ہوئے انہیں پورا یقین دلایا کہ میں استقامت کے ساتھ چلتی ہی چلی جاؤں گی، وہ باکمال الفاظ یہ تھے کہ "بیٹے اگر پی ایچ ڈی کرنی ہے تو صبر کو پلے باندھ لو"۔ بعد ازاں مختلف موضوعات پر ان سے مشاورت ہوتی رہی، آخر کار انہوں نے میرے لیے **"سوشل ویلفیئر کا تصور اسلام اور عصری افکار کی روشنی میں"** منتخب کیا۔

پاکستان جیسے نو آموز ملک کو جس نے دنیا کو نہ صرف اسلامی نظام کا نمونہ بن کر دکھانا تھا بلکہ اُسے سماجی بہبود میں بھی ایسے اعلیٰ درجے تک پہنچانا تھا جس سے دنیا اس کی تعریف کرتی اور اس کے قائم کردہ فلاحی نظام کو دیکھ کر اسلام کے فلاحی نظام سے متاثر ہوتی، پاکستان بنانے والی نسل نے یہی چاہا تھا۔

علمی دنیا میں میرے استاد میرے مربی ڈاکٹر پروفیسر امان اللہ مرحوم کی بھی یہی خواہش تھی۔ اُن کی دور رس بصیرت میرے مقالے کا موضوع تجویز کرنے کی صورت میں سامنے آئی۔ الحمد اللہ میرے رب کریم نے مجھے باعزت طور پر کامیاب فرمایا اور میں اپنے محترم استاد کے سامنے سرخرو ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کی پاکستان کے ساتھ وابستگی جذباتی سے زیادہ علمی اور عقلی نوعیت کی تھی۔ وہ اسلام کو سمجھتے بھی تھے اور پاکستان میں اس کا عملی نفاذ بھی چاہتے تھے۔ وہ اسلام کی اُس شکل کو پاکستان میں متشکل دیکھنا چاہتے تھے جس میں عام آدمی ترقی کرتا ہے اور ہر شخص قانون کے تابع ہوتا ہے۔ فیصلے میرٹ کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور ترقی کے مواقع سب کو مساوی بنیادوں پر حاصل ہوتے ہیں۔ معاشرے میں انصاف کا بول بالا ہوتا ہے۔

لیکن قارئین کرام! پاکستان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا خواب ہنوز منتظر تعبیر ہے۔ ہمیں اس تعبیر کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی بھی شہری کو ہوتی ہے۔ آیئے اس خواب کی تعبیر میں اپنا حصہ ڈال کر ڈاکٹر صاحب کی روح کے لیے تسکین کا سامان کریں۔

زندگی کے مشاہدے نے بتایا کہ تعلیم و تعلم کے میدانِ عمل میں اعلیٰ صفت استاد ہونا اتنا بڑا کمال نہیں جتنا عملی زندگی کی بھاری ذمہ داریوں کے باوجود ایک قابلِ رشک باپ یا ماں ہونا ہے۔ ربِ کریم نے اُن کو قابلِ تقلید روحانی باپ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سگے (Biological) بچوں کے لیے بھی ایک کامیاب باپ بننے کا اعلیٰ درجے کا ہنر عطا کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی زوجہ محترمہ اور اولاد کے لحاظ سے بھی قسمت کے بڑے دھنی تھے۔ مجھے اُن کی اہلیہ محترمہ فرحت امان اللہ صاحبہ سے براہِ راست ملنے کے مواقع میسر آتے رہے، وہ بھی

اسی سال 4 مئی 2023 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں، اللہ تعالیٰ اُن دونوں پر اپنی خاص رحمتیں فرمائے اور درجات بلند ہوں، آمین ثم آمین۔

یہ تو ذکر تھا اُن کی شریکِ حیات کا جو صحیح معنوں میں اپنے شوہر کی قابل تحسین دستِ راست تو تھیں ہی مگر یہ مقولہ بھی بلا مبالغہ اُن پر صادق آتا تھا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ دونوں نے مل کر اولاد پر بھی بہت محنت کی اور اُس کا صلہ بھی خوب پایا، چار بیٹے اور ایک بیٹی اُن کی کل متاع تھی۔

دونوں نے ایک بیٹے کی ناگہانی جدائی کا صدمہ کمال صبر ایوبی سے سہا، جو کہ ائیر فورس میں اپنی ذمہ داریاں سرانجام دیتے ہوئے مقام شہادت سے سرفراز ہوا **( انا للہ و انا الیه راجعون)**، اور اُنھوں نے شہید کے والدین ہونے کا عظیم رتبہ پایا، اللہ کرے کہ آخرت میں ماں باپ اِس اعزاز کا اجر جنت الفردوس کی شکل میں پائیں، آمین ثم آمین۔

اللہ کرے کہ اُن کی اولاد اُن کے لیے بہترین صدقۂ جاریہ ہو، اور نیکیوں کے وہ تمام پودے جو انھوں نے علم کے راستے میں لگائے وہاں گھنے اور ہرے بھرے باغات کی صورت اُن کا پھل پائیں اور سدا اُن کی گھنی چھاؤں تلے رہیں، آمین ثم آمین۔

بحیثیتِ شاگرد میری دلی دعا ہے:

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فُروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

★★★★★

## ادارہ علومِ اسلامیہ کے مرحوم اساتذہ کی یاد میں شائع ہونے والی ارمغانِ علمی

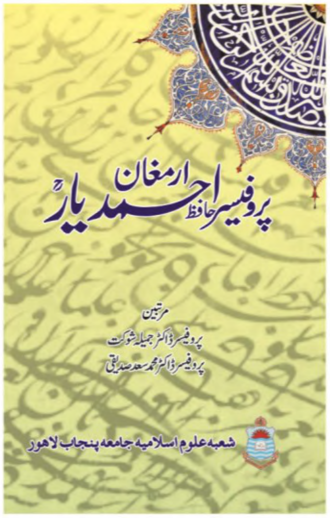


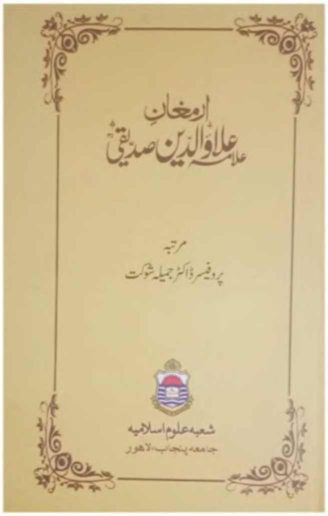


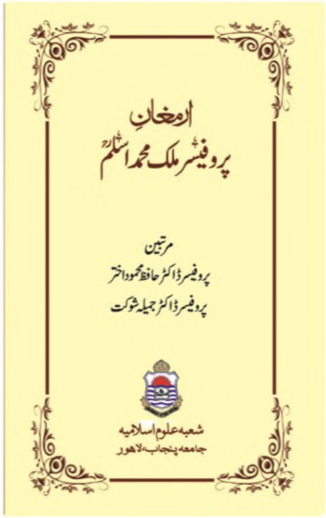

*پروفیسر مُستنیر احمد علوی

# ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم
## علومِ اسلامیہ کے ایک بیدار مغز استاد

ایم۔اے علومِ اسلامیہ کے دوران ستمبر ۱۹۷۶ء تا مئی ۱۹۷۹ء آپ سے شرفِ تلمذ رہا، تاریخِ اسلام کا پرچہ اِس جلیل القدر اُستاد کے حصے میں آیا۔ انہیں تاریخِ اسلام پر زبردست عبور حاصل تھا اور اظہار کی بھی غیر معمولی طاقت، اللہ نے اُنہیں عطا کر رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتے، مدلل گفتگو کرتے، مخاطب کو اچھے اسلوب میں سمجھاتے اور اپنا ہم نوا بنا لیتے تھے۔

کلاس میں آکر مجھ جیسا کوئی احمق طالبِ علم، اُلٹا سیدھا سوال کر بیٹھتا تو ہنس کر ٹال دیتے یا خاموشی اختیار کر لیتے (جو کہ ایک مشکل کام ہے)۔ جب ہمارا سیشن شروع ہوا صدرِ شعبہ کی ذمہ داری بھی آپ کے کندھوں پر تھی مجھے کوئی ایسا دن یاد نہیں کہ آپ نے کلاس نہ لی ہو اور ہمیں بتایا گیا ہو کہ صدرِ شعبہ دفتر میں مصروف ہیں۔

---

* سابق صدر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ شالیمار کالج، لاہور

وہ ایک اچھے منتظم بھی تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کو بہت عمدگی سے تقسیم کیا ہوتا تھا اور سارا دن ہمہ قسم کے امور بروقت سرانجام دیتے۔ ان کی یہ بھی ایک خوبی تھی کہ انتظامی امور میں ماتحت عملہ کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے، معتدل اور متوازن رویہ رکھتے۔

ہم نے کلاس کے اندر بھی اُن سے سیکھا اور کلاس کے باہر بھی۔ میرے وہ صرف استاد نہیں تھے بلکہ محسن بھی اور مربّی بھی، مجھے ان کا خصوصی التفات حاصل رہا، شفقت سے پیش آتے اور ہر معاملہ میں سرپرستی فرماتے۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب ریڈیو پاکستان، مختلف پروگراموں کے لیے تشریف لے جاتے۔ ان میں سے ایک پروگرام میں آپ کی گفتگو کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوتی، چنانچہ آپ مجھے سوالات کے لیے ساتھ لے جاتے، یوں آپ نے میری تربیت کی۔

وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ایک میگزین **پاک جمہوریت** میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ آپ ایک دن مجھے ساتھ لے گئے اور اس کی ایڈیٹر کشور ناہید صاحبہ سے متعارف کروایا، اس کے بعد کافی عرصہ تک میرے مضامین اس میگزین میں شائع ہوتے رہے۔

ان دنوں لاہور میں جب حکیم محمد سعید (مرحوم) کا مشہور پروگرام **شامِ ہمدرد** ہوتا تو آپ ان پروگراموں کے دعوت نامے طلبہ میں تقسیم کرتے کہ ہمارے شعبہ کے طلبہ سوچنے اور سمجھنے کے قابل بنیں۔ آپ تمام طلبا اور طالبات سے انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ہر وقت ہمیں ہی بنانے اور سنوارنے میں مصروف رہتے۔ کسی بات پر غصہ آجانا تو ایک فطری امر ہے مگر غصہ آنے پر خاموشی اختیار کر لینا، یہ بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ دو اڑھائی سال تو ایم۔اے کے دوران ان کا قُرب نصیب رہا مگر بعد میں کئی سالوں تک درِ دولت پر حاضری نصیب ہوتی رہی۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے اور مہمان نوازی بھی کرتے۔ میں اگر اپنی پچھلی زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو ایم۔اے کا زمانہ جو کم و بیش نصف صدی پہلے گزر چکا ہے، میری نظروں کے سامنے چمکدار ستارے کی مانند آجاتا ہے۔ زندگی کے وہ لمحے یقینی طور پر سب سے قیمتی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دین کا مطالعہ کرتا ہے اور آگے منتقل کرتا ہے تو لامحالہ اس کی شخصیت پر اخلاقِ محمدی ﷺ کے گہرے نقوش مرتب ہوتے ہیں اور وہ پیکرِ مہر و وفا بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب کے علاوہ محترم ڈاکٹر بشیر احمد صدیقیؒ، پروفیسر حافظ احمد یارؒ، ڈاکٹر خالد علویؒ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقیؒ اور علامہ علاء الدین صدیقیؒ صاحب جیسے اساتذہ نے ایک جہان کو منور کیا۔ ان لوگوں کے اخلاق اور علم کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

قدرت کا انتظام دیکھئے کہ ان ہی لوگوں کی ایک ہم عصر اور ہم پایہ شخصیت، ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ کو اِن کے ارمغان ہائے رنگا رنگ تالیف کرنے پر متعین فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحبہ کو صحت و سلامتی والی طویل عمر عطا فرمائے۔ امین

ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب کی علمی شخصیت کا وہ پہلو، جس نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ان کی جدت فکر تھی، وہ کچھ نیا چاہتے تھے یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ آج ملتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کی اسلامی روح بھی برقرار رہے اور عصری مسائل کا حل بھی نکل آئے۔ ڈاکٹر صاحب نئے تحقیقی کام کو ہمیشہ پسند کرتے تھے۔

چنانچہ جب میں نے پی ایچ۔ ڈی پہ کام شروع کیا تو آپ کا خیال یہی تھا کہ میں **فتاویٰ عالمگیری** کے تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ پہ کام کروں۔ میرا یہ موضوع منظور بھی ہو گیا مگر بوجوہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک بیدار مغز انسان تھے۔ مستشرقین نے جتنا بھی کام کیا اس پہ ان کی گہری نظر تھی اسلام پر کیے گئے اعتراضات کے جوابات انہیں ازبر تھے۔

فقہِ اسلامی کی تدوینِ نو کے شدّ و مد سے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد چند سال کے اندر اندر خلیفہِ ثانی نے **اولیاتِ فاروقی** کے نام سے قانونی اصلاحات جاری کر دیں تو آج بھی دین کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے ایسا ہو سکتا ہے۔ اس انداز میں اگر دین

اسلام پہ غور کیا جائے تو ہر دور کے لیے اسلام ایک تازہ خورشید بن کر اُبھر سکتا ہے۔ آپ صبح کے نور اور نسیمِ سحر کے منتظر تھے۔ بقول علامہ اقبال:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں، محرمِ راز درون میخانہ
کلی کو دیکھ! کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اِسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

★★★★★

*راحت شاہین

# ڈاکٹر امان اللہ خانؒ اور میرا شعورِ تاریخ

طویل عرصہ بعد شعبہ علومِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں گزرے دن یاد کرنے کا موقع ملا ہے۔ ذہن میں کئی نابغہ روزگار شخصیات کے خاکے اور یادیں گردش کر رہی ہیں، جنھوں نے اپنی حیاتِ مستعار علم کے شجر طیبہ کی آبیاری میں وقف کر دی۔ شعبہ علومِ اسلامیہ میں ان اعلیٰ عزائم کی حامل ہستیوں میں سے ایک میرے استاد محترم ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم ہیں۔ اس تحریر کا مقصد اسلامی تاریخ کے گرامی قدر استاد ڈاکٹر امان اللہ خان کی شخصیت اور تدریسی مہارت کے بارے میں اپنے احساسات و تاثرات پیش کرنا ہے۔

ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب معتدل قامت و صاف رنگت کے ساتھ نفیس، وجیہہ اور پُر وقار شخصیت کے حامل تھے۔ مزاجاً سادہ، صاف گو اور جرأت مند تھے۔ میں کمرہ جماعت میں استادِ گرامی کے اسلامی تاریخ پر اسباق و دروس (لیکچرز) یاد کروں تو آج بھی دل بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے کہ بلاشبہ وہ تاریخ کے باکمال اُستاد تھے۔

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، چیئر پرسن شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، ماڈل ٹاؤن، لاہور

انہوں نے طلباء وطالبات میں اسلامی تاریخ کو غیر جانبداری اور جدید رجحانات کے ساتھ سمجھنے کی تحریک پیدا کی، بالخصوص اعتقادات کو اسلامی تاریخ کے تناظر میں زمانہ جدید کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا شعور پیدا کیا۔ وہ تاریخی واقعات کو سچائی، گہرائی اور صحیح تناظر میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ یوں وہ اپنے تلامذہ کو دورِ جدید کے تقاضے مدِ نظر رکھتے ہوئے اسلامی تاریخ کی تفہیم نو کا سفر طے کرواتے تھے۔ اس باب میں انہوں نے ایک نئی جہت کا اضافہ کیا کہ اسلامی تاریخ سے اجتہاد کر کے دینی اعتقادات کا زمانہ جدید کے موافق ابلاغ کیا جائے تا کہ نسلِ نو کو عصر حاضر اور مستقبل کے لیے راہنمائی مہیا کی جا سکے۔ وہ اس رُخ پر تحقیقی کام کرنے کے لیے تلامذہ کی ہمت افزائی بھی کرتے، مثلاً ان کا موقف تھا کہ اولیات حضرت عمر فاروقؓ کی روشنی میں فکری ارتقاء کی راہیں اور جدید مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر امان اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی شعبہ علومِ اسلامیہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مکمل کرنے والے پہلے سکالر تھے۔ ان کا تحقیقی مقالہ **بلاذری کی خدماتِ تاریخ کے جائزے** بزبان انگریزی تھا جو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ متعدد طلباء وطالبات کے ایم اے اور پی ایچ۔ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالات کی راہنمائی و نگرانی بھی کی جن میں بیرون ملک کے طلباء بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے شاگردوں میں ایک اچھوتے شعورِ تاریخ کو جلا بخشی جس سے ہمیں فہم تاریخِ اسلامی میں درپیش اشکال و شبہات حل کرنے میں مدد ملی۔ آج ہم بھی بحیثیت استاد ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے تلامذہ کو تاریخِ اسلام کا غیر جانبدارانہ اور صحیح تصور و شعور دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں صدقہ جاریہ ہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ڈاکٹر امان اللہ خان مرحوم اپنے وقت سے کئی برس آگے کی سوچ کے حامل تھے۔ وہ بلند مرتبہ محقق و مدرس تھے۔ مجھے ان کی شاگرد ہونے پر فخر ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی آخرت کی منزلیں آسان فرمائے اور ان کی روح کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

★★★★★

*ڈاکٹر اعجاز احمد

# میرے محسن: پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ خانؒ

سر! آپ کلاس میں تشریف نہیں لائے تھے۔ آپ اپنے کمرے میں بھی نہیں تھے؟
او پتر امیں ۲۲ گریڈ دے مزدوراں نوں سبق پڑھان گیا سی۔ اس لئے نہیں آسکا۔ آج زیادہ کام کر لیتے ہیں۔ بڑی بے تکلفی سے بات کرنے والے یہ تھے ڈاکٹر امان اللہ خان۔

گہری بصیرت اور عصر جدید کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے علوم اسلامیہ میں ایم۔اے پارٹ ون میں داخلے کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فراواں محبت ہمارے حصے میں آئی۔ ذرا قریب ہوئے تو ڈاکٹر صاحب کے احترام کے ساتھ محبت کی آمیزش ہو گئی۔ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی کہ جن کے کلاس فیلو ہونے کا اعزاز مجھے حاصل ہے۔ ہم دونوں کو ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی یونیورسٹی کی رہائش گاہ پر بلایا۔ چائے پلائی اور ہمیں زندگی کو سمجھنے میں مدد دی۔ کلاس رومز کی رسمی تعلیم ڈگری کے حصول میں مددگار ہوتی ہے لیکن کسی استاد کا اپنے طلباء کے ساتھ غیر رسمی تعلق طلبہ کو ناخنِ تدبیر عطا کرتا ہے۔ جس سے وہ زندگی کی گرہوں کو کھول سکتے ہیں۔ مشکلوں کو سلجھا سکتے ہیں۔ استاد محترم! اپنے مضامین پر حیرت انگیز گرفت رکھتے تھے۔ عمرانی و سیاسی افکار پر

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور

گفتگو کرتے، مسلم مفکرین کی خدمات کے ساتھ ساتھ مغربی دنیا کے جدید مفکرین پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے۔ مغربی دنیا کی مادی ترقی کا راز آشکار کرتے اور طلباء کے تعمیری جذبے کو مہمیز کرتے۔ اسی طرح سیرت کے موضوع پر آپ کے ابتدائی لیکچرز بہت اعلیٰ تھے۔ رسول ﷺ کی محبت میں ڈوبے ہوئے جملے، آپ ﷺ کی سیرت امت کی زندگی میں کیسے انقلاب برپا کر سکتی ہے اس موضوع پر مبنی گفتگو طلباء پر سحر طاری کر دیتی۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ انتظامی ذمہ داریوں پر بھی فائز رہے۔ اس لئے نظم وضبط کے خود بھی پابند تھے اور دوسروں سے بھی یہی تقاضا کرتے۔ ایڈمنسٹریشن سے عام طور پر شکایت ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن کلاس روم میں آپ کا رویہ نہایت محبت والا رہتا تھا۔ آپ کے سٹوڈنٹس آپ کی شفقت سے فیض یاب ہوئے۔ نہایت متانت کے ساتھ پیش آتے تھے۔

ایم اے پارٹ ٹو میں مقالہ تحریر کیا۔ یہ خوش قسمتی تھی کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی زیر نگرانی کام کرنے کا موقع ملا۔ میرے مقالے کا عنوان تھا: **حریتِ فکر کا اسلامی تصور**

اس موضوع پر استاد محترم نے ایسی رہنمائی فرمائی کہ تقریباً تیس سال گزر جانے کے بعد آج بھی ایک سنہری یاد دل میں بسی ہوئی ہے۔

مغربی مفکرین نے حریت فکر کے حوالے سے جس افراط و تفریط سے کام لیا تھا اس کے نتائج سے آپ نے آگاہ کیا اور میں حیران ہوں کہ آج ہو بہو وہی نقشہ ہے۔ مغربی ممالک میں مساجد پر حملے اور رسول رحمت ﷺ کی شان میں نازیبا مضامین، خاکے، قرآن مجید کی تضحیک کی ناپاک کوشش اور آنے والے دنوں کے ناپاک عزائم۔ ان حالات پر آپ نے دہائیوں پہلے خبر دار کیا اور توجہ دلائی۔ آپ کہا کرتے تھے کہ پترو! آنے والے چیلینجز کے لئے تیاری کرو۔ اہل مغرب کی فکر کو سمجھو۔ آپ آنے والی نئی کتابوں کے حوالے سے جدید ترین معلومات فراہم کرتے۔ ان دنوں کمپیوٹر، فیس بک اور یوٹیوب وغیرہ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ آپ ذاتی محنت سے ہماری رہنمائی فرماتے۔

اہل مغرب جب بھی اسلام اور اسلامی تعلیمات، رسول ﷺ اور قرآن حکیم کے خلاف کوئی نیا فتنہ اٹھاتے ہیں تو گاہے گاہے ڈاکٹر امان اللہ خان بہت یاد آتے ہیں۔

آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیٹے کی جوانمرگی کا صدمہ بڑے حوصلے سے برداشت کیا، بیماری کا مقابلہ کیا اور **كل نفس ذائقة الموت** کے فطری اصول کے تحت جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

ہم آج بھی دعا گو ہیں اللہ رب العزت انکی حسنات قبول فرمائے اور علم کے جو چراغ انہوں نے روشن کئے تا قیامت انہیں ان کے حصے کی روشنی پہنچتی رہے۔ **آمین یا رب العالمین**۔

★★★★★

## ادارہ علومِ اسلامیہ کی اساتذہ محترم کی تالیفات

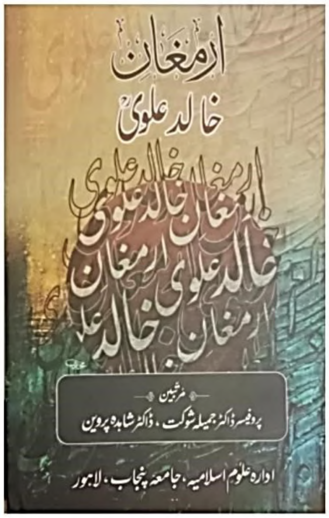


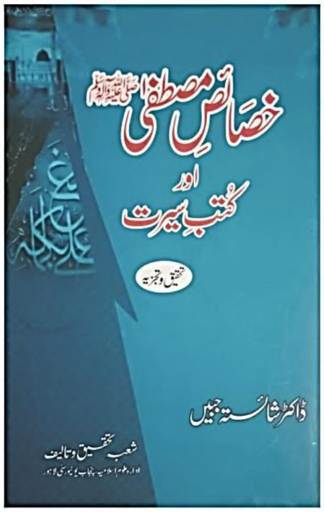


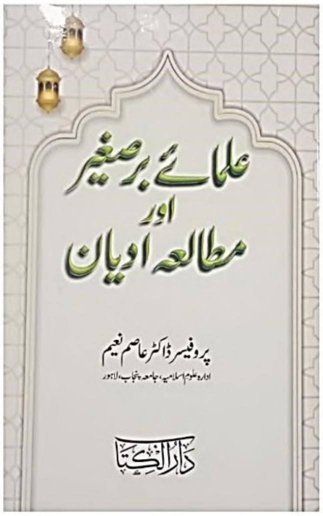


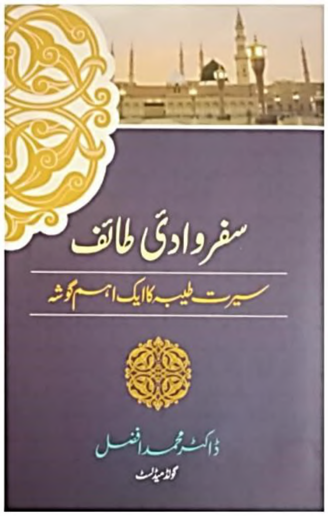

*راحت عباس ظہیر ڈولہ

# ڈاکٹر امان اللہ خانؒ۔ ایک مثبت شخصیت

ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب کا نام آتے ہی سوچوں اور خیالات کا ایک سمندر ہے جو موجزن ہو جاتا ہے۔ انسان کتنا ہی سمجھدار اور دانا ہو کافی کچھ اس زمین پر اس کی سمجھ نہ آنے والا ہے اس میں انسان کی مختلف عادات و اطوار اور انسانی رویئے بھی شامل ہیں جن کو انسان سمجھنے اور جانچنے میں عمریں بیتا دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے۔ علمی طور پر تو میں ان کے بارے میں اتنا کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے ان سے صرف سال اوّل میں تاریخ ہی پڑھی ہے لیکن بحیثیت ایک شخصیت اور ادارہ علومِ اسلامیہ کے سربراہ کے ان کے بارے میں کافی کچھ کہا جا سکتا ہے۔

انتہائی سمجھدار اور موقع کی مناسبت سے ردِ عمل دینے والے منتظم تھے اور کبھی بھی موقع کی مناسبت سے چوٹ لگانے سے نہیں چوکتے تھے۔ منفی رویّوں اور واقعات کو مثبت رنگ دینے میں ان کا ثانی کوئی نہ تھا۔ کسی بھی صورتِ حال میں گھبراتے نہیں تھے جو طالبِ علم کو یہ باور کروائے کہ وہ اس سے ہی محبت رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت بھی سب سے زیادہ ہے۔ حالات خواہ کیسے ہی ہوتے ان

---

* سابق طالبِ علم ادارہ علومِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

پر قابو پانا اور ان کو اپنی طرف موڑنا جانتے تھے۔ اپنے ماتحت عملہ اور تمام تدریسی سٹاف کو بھی اچھے انداز میں ہینڈل کرتے۔ ہر ایک سے ایک علیحدہ تعلق قائم رکھتے اور اجتماعی طور پر کبھی بھی ان افراد کو اکٹھا نہ ہونے دیتے کہ کبھی کوئی انتظامی طور پر مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔ وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرتے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو جاتے۔

شعبہ جب اولڈ کیمپس سے شیخ زاید اسلامک سنٹر میں منتقل ہوا تو کافی مشکل صورتحال تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ سنٹر کا کنٹرول شعبہ علومِ اسلامیہ کو نہیں دینا چاہتی تھی لیکن طلباء نے سنٹر میں آکر کلاسیں شروع کروا دیں۔ اب ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب کے لیے بڑی آزمائش تھی انہوں نے بہر حال بڑی اچھی حکمت عملی مثبت انداز میں بنائی اور تمام ملبہ ہم طلباء پر ڈال دیا اور خود انتظامیہ کے طرفدار بن گئے۔ اسلامک سنٹر میں ان دِنوں اے سی وغیرہ ابھی ورکنگ کنڈیشن میں نہ تھے اور فرشی پنکھے استعمال ہو رہے تھے جو کہ تعداد میں پورے نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بار بار درخواست گزار کی لیکن بات نہ بنی ایک دن ان کے دفتر میں حاضر ہو کر دفتر کا پنکھا اٹھانے کی بات ہوئی تو کہنے لگے میرے دفتر کا پنکھا کون اٹھائے گا پنکھا میں نے اُٹھالیا تو فوراً گویا ہو کہ مجھے صرف ایک ہی اُمید تھی کہ تم ہی یہ پنکھا اُٹھاؤ گے پھر مجھے علیحدہ بلایا اور کہا کہ پتر اتیری استانی (ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ) آلو والے پراٹھے بڑے اچھے بناتی ہے کل صبح ناشتے پر میرے گھر آنا۔ بہر حال ان کی خوبی تھی کہ بندے کو شیشے میں اتار لیتے۔ ایک دفعہ مجھے کہتے آپ کی آنکھوں میں عقاب کی آنکھوں والی چمک ہے۔ تمہیں اخبار میں نوکری نہ دلوادوں اس طرح کی باتیں وہ دوسرے طلباء سے بھی کرتے اور اپنی شخصیت کے سحر میں مبتلا کرتے رہتے۔ تدریسی ماتحت عملہ کے بارے میں اتنا مثبت رویہ نہ رکھتے تھے لیکن شعبہ کے نظم وضبط بارے ہمیشہ فکر مند رہتے۔

خلیق اور بردبار انسان تھے ان کی یاد ہمیشہ آتی ہے جب بھی دوست احباب مل بیٹھتے ہیں ان کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں ہوتا ہے۔ اللہ پاک جنت میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔ **آمین یا رب العالمین**

★★★★★

members and staff of the Institute to keep their predecessors' names and works alive are much appreciable. In this regard the family specially acknowledges the dedication, love and contributions of Prof. Dr. Jamila Shaukat. May Allah bless all those who are associated with the Institute of Islamic Studies in any capacity, guide them to the right path, grant them success, reward them and elevate their status in both this world and the Hereafter. Aameen!

With profound regards and request for prayers,
All family members of Prof. Dr. Aman Ullah Khan

25th May, 2023
Lahore, Pakistan

★★★★★

organizational leadership and management subjects to executive students at IBA and IAS, University of the Punjab, as visiting faculty member. His third son, Imran Ahmad Khan is an experienced and highly competent engineer, presently appointed as Chief Engineer in Sui Northern Gas Pipelines Ltd (SNGPL), and serving the nation with commitment and devotion. The youngest son, Irfan Ullah Khan after completing Master of Business Administration, successfully worked at renowned industrial setups in different managerial capacities and is recognized as an honest, outstanding and talented manager. His daughter, Sadaf Khan whom he loved the most among his children, achieved many academic distinctions including President Talent Award and a gold medal in MSc Botany for obtaining the first position from Lahore College for Women University. She has also been working there as Assistant Controller. Entire family members greatly admire his guidance, teachings and endeavors in their intellectual and moral development.

He always taught to have unwavering belief in Almighty Allah and to follow the Sunnah (traditions) of the Holy Prophet Hazrat Muhammad (peace and blessings of Allah be upon him). He always upheld the principles of honesty, truthfulness, piety, modesty, simplicity, self-sacrifice, humility, forthrightness, selflessness and altruism, and at the same time endeavored to instill these qualities in his children and students. This celebrated scholar of Islam left for his final abode on 17th February, 2006 and was buried at the graveyard of Quaid-e-Azam Campus, University of the Punjab, Lahore. May Allah accept his sincerity to strengthen Pakistan and dedicated efforts for the cause of nation building. May Allah reward him for his devotion in spreading the light of Islam. May Allah shower His blessings upon him and grant him the highest place in *'Jannat-ul-Firdous'*. Aameen!

We all cherish the pleasant memories associated with the Institute of Islamic Studies. There has always been a strong institutional culture of mutual respect and affection among the faculty members, staff and the students. Participation in each other's moments of happiness and grief, speaks volumes of the strength of the organizational culture. The family like atmosphere, mutual respect, caring attitude and effective management demonstrated during the excursions, specially the northern areas trips was commendable and unforgettable. Efforts of all faculty

Muslim scientists and philosophers' contributions in the advancement of natural and social sciences, awakening and enlightenment of the humanity, and towards culture and civilization; Islamic judicial system; Islamic concept human resource development; contemporary challenges faced by Pakistan and the Ummah and their solutions taking into account the governance model of the State of Madinah and the Pious Caliphs. Besides that, he was a distinguished speaker who kept on sharing his prolific thoughts at Radio Pakistan and Pakistan Television on the teachings of the Holy Qur'an and Sunnah, and gave solutions to multidimensional issues related to Pakistani society and the present-day Islamic world. He delivered around one thousand such speeches. PTV's popular weekly program *'Tajalli'* (literally meaning manifestation, revelation or disclosure) was hosted by him, where discussions of great academic and practical value were generated. He was member of more than twenty learned academic bodies. He participated in more than fifty national and international conferences and delivered lectures to Pakistan's military leadership, judicial officers, civil bureaucracy and other students as guest speaker at National Defence University Islamabad, Command and Staff College Quetta, National Institute of Public Administration Lahore, Pakistan Administrative Staff College, Civil Services Academy Lahore, WAPDA Staff College, University Grants Commission (present day Higher Education Commission), Ulema Academy, International Institute of Economics, and many other reputable institutions.

We the family members of Prof Dr. Aman Ullah Khan, remember him as an affectionate father, a loving husband and a caring brother. He together with our mother, Mrs. Farhat Ara Aman (may Allah have mercy on her) – an educated, simple, selfless, kind-hearted, thoroughly dedicated and practicing Muslim lady, groomed us to become good human beings, devoted Muslims and patriot Pakistanis. His son, Wing Commander Rizwan Ullah Khan, an outstanding fighter pilot of Pakistan Air Force embraced *'Shahadat'* (martyrdom) in the line of duty in 2005, and was awarded *'Sitara-e-Basalat'* (posthumously), the highest non-operational gallantry award of Pakistan Armed Forces. His eldest son, Major Salman Ahmad Khan Zaighum fought 'Siachin War' and was also decorated with *'Sitara-e-Basalat'*. After retirement from Pakistan Army, he did MPhil and has been teaching

the prestigious Department of Islamic Studies at University of the Punjab, Lahore in the year 1963.

Allama Ala-ud-Din Siddiqui, then chairman of the department who later became Vice Chancellor of University of the Punjab, soon selected his brilliant student Aman Ullah Khan for the doctorate of philosophy, considering his talent in research. Under his able guidance and supervision, he completed his PhD in 1971, "A Critical Study of Al-Bladhuri as a Historiographer" that was the first ever PhD produced by the department and also first ever indigenous PhD in Islamic studies from Pakistan (http://pu.edu.pk/images/Departments/Islamic-Studies/List-thesis-MPhil-PhD.pdf). Dr. Aman Ullah Khan had the honor of supervising twenty-four PhDs, accomplished by Islamic studies students that included foreign nationals who had come to Pakistan for their doctorate (details in the reference quoted above). He was promoted as Assistant Professor in 1970, Associated Professor in 1978 and Professor in 1982. He was the favorite teacher of students who enlightened their thoughts and always created an atmosphere of interest in the class. Besides students' learning, he always focused on their character building. He remained Chairman of the Islamic Studies Department for ten years. His efforts helped in establishing a strong foundation of research culture in the Institute and strengthened its reputation at national and international levels.

Prof. Dr. Aman Ullah Khan had a tremendous aptitude for research. His published work includes hundreds of research articles to his credit. He remained member of the editorial boards of reputed research journals. His research focused on the importance and applicability of the concepts of science, exploration of the universe, welfare state and society, equity and justice, social justice, economic justice, governance, human development, human rights and responsibilities, women education and rights, labor rights and dignity of work, moral development, respect and dignity, accountability, tolerance and universal brotherhood, in the light of the Holy Qur'an, Seerah (life) of the Holy Prophet Hazrat Muhammad (peace and blessings of Allah be upon him), Fiqh (Muslim jurisprudence), Islamic history and the works of the great philosophers like Imam Ghazzali, Al-Farabi, Ibn-e-Sina, Ibn-e-Khaldun, Shah Wali Ullah and Allama Muhammad Iqbal. He extensively wrote on the relation of Islam and science, modern political, social and economic system;

* Salman Ahmad Khan Zaighum

# Prof. Dr. Aman Ullah Khan
## Family Memoirs

In the name of Allah, the most Beneficent the most Merciful. Praise be to Allah, the Cherisher and Sustainer of the Worlds. Peace and blessings of Allah be upon Hazrat Muhammad (PBUH), and upon his relatives and the companions.

Prof. Dr. Aman Ullah Khan (may Allah have mercy on him), former Chairman Department of Islamic Studies, University of the Punjab, Lahore was born on 25th of April, 1933 at Kharian in a respectable family that had deep roots for the love of Islam and its teachings. His father Mr. Muhammad Usman Khan and grandfather Mr. Qudrat Ullah Khan were devoted Muslims and well-known for their passion for knowledge and learning. His mother Mohtarma Sultan Begum was a practicing Muslim lady.

His family had preserved a large collection of books of great scholastic value which proved to be a source of great inspiration for their son in the quest of knowledge and wisdom. In those days, matriculation exams were conducted by University of the Punjab. Young Aman Ullah Khan passed that exam in first division. In view of his interest in further education his parents decided to shift to Lahore, where he kept on pursuing his academic goals. After doing Masters of Arts in the subjects of Islamic Studies and History in 1958 and 1959 respectively, he was appointed Asia Foundation Research Fellow in 1961. He was selected lecturer in

* MSBA scholar at Lahore Garrison University, Pakistan

## ادارہ علوم اسلامیہ کی اساتذہ محترم کی تالیفات

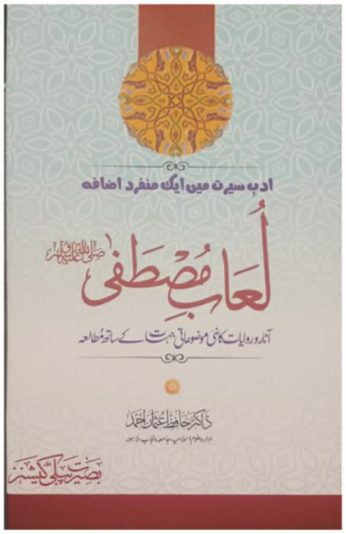


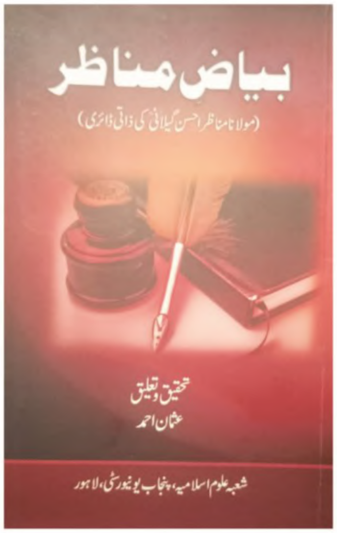


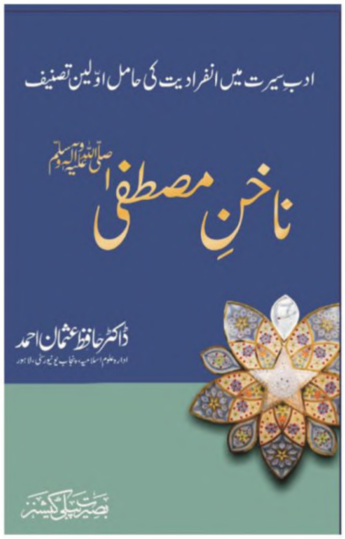


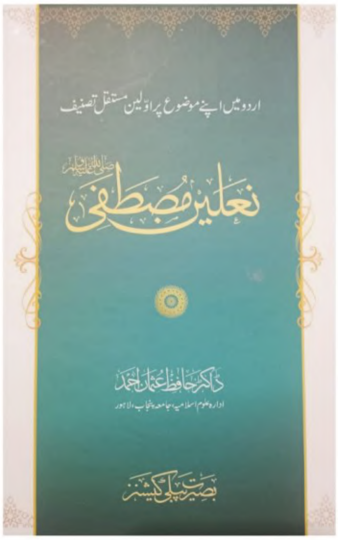

# اُردو مقالات

*ڈاکٹر امان اللہ خان

# میثاق مدینہ کی اہمیت و افادیت

ایک عظیم الشان ریاست کی تاسیس اور تدبیر و تنظیم سرکار دو عالم ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ ایک ایسی شخصیت جسے اپنے ہم وطنوں نے وطن چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا جو ہجرت کے سفر کی مشکلات برداشت کرتے ہوئے 1ھ میں یثرب (مدینہ) پہنچتی ہے اور اس شہر کے چند محلوں پر مشتمل ایک شہری ریاست قائم کرتی ہے۔ یہ ریاست اوسطاً ۲۷۴ مربع میل فی یوم کی بے نظیر سرعت کے ساتھ بڑھ کر دس سال کی قلیل مدت میں دس لاکھ مربع میل ہو جاتی ہے۔ پورا عرب جس میں لاقانونیت اور انتشار کی کیفیت تھی اور جس نے ایک جھنڈے ایک قانون اور ایک حکومت کے ماتحت اکٹھا ہونا سیکھا ہی نہیں تھا یک پرچم اسلام کے نیچے متحد و منظم ہو جاتا ہے اور پیغمبر آخر الزمان کی روحانی وسیاسی قیادت کو تسلیم کر لیتا ہے۔

آنحضور ﷺ قبائلی عصبیت و قومیت کے بت کو پاش پاش کر کے اس کی جگہ پر ایک عالمگیر برادری قائم کرتے ہیں۔ رنگ، نسل، خاندان، زبان اور وطن سے بالاتر ایک امت اور ملت کا قیام

---

* ماہنامہ فکر و نظر، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، مئی ۱۹۷۸ء، ص ۴۵۔۶۱

عمل میں لاتے ہیں۔ غیر مسلموں اور مختلف مذہبی گروہوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہوتا ہے۔ ریاست اور شہریوں کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

انصاف اور قانون کی حکومت قائم ہوتی ہے اور قانون کے سامنے مساوات کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے اصول وضوابط مرتب ہوتے ہیں۔ شوریٰ کی فضیلت قائم ہوتی ہے۔ انسانی شرف و عظمت کی حرمت قائم ہوتی ہے۔ شہریوں کی روحانی و اخلاقی، معاشرتی و معاشی اور تعلیمی و سیاسی زندگی کے ضابطے وضع کر کے ان کا عملی نفاذ کیا جاتا ہے۔ قوانین صلح و جنگ مرتب ہوتے ہیں، خارجہ پالیسی کے اصول اور طریق کار کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ الغرض انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر اور فلاح و بہبود نیز ایک اعلیٰ وارفع اسلامی فلاحی مملکت کے قیام کے سلسلے میں جتنے بھی ضروری اقدامات ہوسکتے ہیں کیے جاتے ہیں۔

ان سارے موثر انتظامات کا اثر یہ ہوا کہ جب ربیع الاول سنہ ۱۱ھ میں ھادی دو جہاں اس دنیا سے رخصت ہوئے تو کم و بیش پورا عرب آپ کی سیادت کا دم بھر رہا تھا اور آپ اپنے پیچھے ایک ایسی منظم امت چھوڑ گئے جو اعلیٰ اخلاق، ایثار و اخلاص اور اتحاد و ایمان کی دولتوں سے مالامال تھی۔ رنگ و نسل، خاندان و زبان اور علاقے کے امتیازات سے بالاتر اس ملت نے آپ کے مشن کو جاری رکھا اور پوری نسل انسانی کو اس نئے نظام حیات کی برکتوں سے مالامال کر دیا۔ نتیجۃً پورا عالم ایک ایسی خوشگوار تہذیبی و تمدنی تبدیلی سے ہمکنار ہوا جس کی مثال اس سے پہلے تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

ایک نئی ریاست اور جدید معاشرے کی تاسیس و تشکیل کے سلسلے میں میثاق مدینہ کو بڑی اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آنحصور ﷺ جب سنہ ۱ھ میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو بہت سے مسائل کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ مثلاً:

۱۔ اہل اسلام کو یکجا اور متحد کر کے انہیں ایک امت و ملت بنانے کی ضرورت تھی۔

۲۔ مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی اصلاح و تربیت کا مسئلہ درپیش تھا۔

۳۔ مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرنا ایک اہم ترین مسئلہ تھا بالخصوص جب کہ مدینے میں یہود کے دس قبائل اور اوس و خزرج کے بارہ قبائل آباد تھے۔ اوس و خزرج میں مسلمان بھی تھے اور بت پرست بھی۔ اوس و خزرج اسلام کی آمد سے پہلے باہم ایک خونریز جنگ میں مبتلا رہ چکے تھے جسے جنگ بعاث کہا جاتا ہے۔ قبائلی عصبیت پورے زوروں پر تھی۔

۴۔ اسی طرح ایک مسئلہ شہر کی سیاسی تنظیم اور اس کے تحفظ و دفاع کا انتظام تھا۔

سرکار دو عالم ﷺ نے کمال دانائی اور حکمت سے ان تمام مذکور مسائل کو پوری کامیابی سے حل کیا، مثلاً:

۱۔ ایک اُمت بنانے کے لیے اہل اسلام کو رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر کر کے انہیں رشتہ اخوت میں یہ کہتے ہوئے **انما المؤمنون اخوۃ. واذ کروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فألف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا** منسلک کر دیا۔ اس طرح خاندانی، قبائلی اور خونی رشتوں پر رشتہ اسلام کو ترجیح حاصل ہوئی اور ایک ایسی نئی ملت تیار ہوئی جو خالص دینی اور انسانی اقدار پر مبنی تھی۔ اسے ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک قبلے اور ایک ہی مقصد زندگی سے وابستہ کر دیا گیا۔

۲۔ مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی تربیت و اصلاح اور ان میں مرکزیت پیدا کرنے کے لئے مسجدِ نبوی کی تعمیر ہوئی اور مسجد مسلمانوں کی روحانی، سماجی، تعلیمی و عدالتی سرگرمیوں کا مرکز و محور قرار پائی۔

۳،۴۔ مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کو متعین و منضبط کرنے کے لئے نیز اس شہر کی سیاسی تنظیم اور تحفظ و دفاع کے لئے ایک تحریری معاہدہ کیا گیا جسے ہم **میثاقِ مدینہ** کے نام سے پکارتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے اس معاہدے کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ایک ایسے وقت میں تحریر کروایا جب قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا۔

اور صحابہ کرام کو یہ واضح ہدایت تھی کہ وہ آپ سے قرآن حکیم کے سوا کچھ نہیں لکھیں گے۔ اس میثاق کے لئے آپ نے **کتاب** اور **صحیفے** کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے اس دستاویز کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی مشہور کتاب The First Written Constitution in the World میں مضبوط دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ میثاق مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جسے خود ریاست کے حاکم اعلیٰ نے نافذ کیا(1)

میثاق مدینہ کی تفصیلات کا علم ہمیں مختلف بنیادی اور ثانوی مآخذ و مصادر سے ہوتا ہے۔ وہ اہم بنیادی مآخذ جنہوں نے اس معاہدے کی مکمل تفصیلات درج کی ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ محمد ابن اسحاق کی **السیرۃ النبویۃ** جس کا فارسی اور انگریزی ترجمہ دستیاب ہے۔

۲۔ ابن ھشام کی **السیرۃ النبویۃ**

۳۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام کی **کتاب الاموال**

۴۔ حافظ ابن کثیر کی **البدایۃ والنہایۃ**

محمد ابن سعد، البلاذری، ابن جریر طبری، ابن خلدون اور دیگر قدیم مؤرخین نے اس معاہدے کا ذکر ضرور کیا ہے مگر تفصیلات درج نہیں کیں۔ احادیث کی کم و بیش جملہ اہم کتابوں میں اس معاہدے کا ذکر ہے مگر تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ معروف اہلِ علم مثلاً علامہ زرقانیؒ، مقریزیؒ اور **لسان العرب** کے عظیم مؤلف ابن منظور نے بھی میثاق مدینہ پر جزوی روشنی ڈالی ہے۔

ثانوی مآخذ میں زیادہ اہم یہ ہیں:

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ کی کتاب **الوثائق السیاسیۃ** جس کا اردو ترجمہ **سیاسی وثیقہ جات** کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ کی ایک دوسری کتاب **عہد نبوی میں نظام حکمرانی**

۳۔ The First Written Constitution in the World

۴۔ ولہاوزن اور کیتانی کی کتابیں جن کا ذکر پروفیسر منٹگمری واٹ اور ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی کیا ہے۔

۵۔ پروفیسر منٹگمری واٹ کی کتاب Muhammad at Medina

۶۔ مجید خدوری کی کتاب War and Peace in the Law of Islam

۷۔ لیوی کی کتاب Social Structure of Islam

۸۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب **رحمۃ للعالمین**

۹۔ جسٹس امیر علی کی کتاب The Spirit of Islam

اس معاہدے کے مستند ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض اہلِ علم کا یہ اعتراض کہ اس معاہدے کے ضمن میں محمد ابن اسحاق اپنے سے پہلے راویوں کا ذکر نہیں کرتا دیگر قوی تاریخی شواہد کی بنا پر رفع ہو جاتا ہے۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) بڑے پائے کے قابل اعتماد ثقہ عالم ہیں۔ انہوں نے یہ معاہدہ امام محمد بن مسلم المعروف بابن شہاب زہری (۵۸ تا ۱۲۴ھ) کی سند سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کتاب **الاموال** میں یہ عبارت درج ہے:

> آنحضرت ﷺ کا عہد نامہ جو آپ نے مدینہ تشریف آوری پر مؤمنین اور مدینہ والوں کے درمیان لکھوایا، جس میں مدینے کے یہود سے مصالحت کا بیان بھی ہے۔
>
> ابن شہاب کہتے ہیں مجھے روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ معاہدہ تحریر کروایا۔([2])

اس معاہدے کی ایک اہم شق کہ: بنی عوف کے یہود بذاتِ خود اور اپنے حلفاء و موالی کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک جمعیت ہوں گے۔۔۔ کی وضاحت کرکے امام ابو عبید نے بعد میں آنے والے محدثین کی الجھن دور کر دی۔ امام موصوف کہتے ہیں: معاہدے کی اس شق سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دشمنان اسلام کے خلاف (جنگ کی صورت میں) شرط کے مطابق اخراجات کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کرتے رہیں گے۔ رہ گیا دین کا مسئلہ سو وہ بالکل جداگانہ ہے۔

اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں یہی سبب ہے کہ اس سے آگے ہی آپ نے تصریح فرمادی کہ یہود اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور مؤمنین اپنے دین پر۔(3)

المقریزی کے بیان کے مطابق یہ تحریر شدہ دستور آنحضور ﷺ کی تلوار سے لٹکا رہتا تھا۔ آنحضور ﷺ کے بعد یہ تلوار حضرت علیؓ کو ملی۔ حضرت علیؓ نے اس دستاویز کے کچھ حصے کوفہ میں لوگوں کو پڑھ کر سنائے۔(4)

اس معاہدے کے مستند ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پوری عبارت میں کوئی بھی ایسی شق نہیں جو اسلام کی پالیسی یا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ مزید برآں یہ ایک مسلسل اور مرتب عبارت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک ہی تھا۔

پھر دور حاضر کے کم و بیش جملہ مستشرقین اور مسلمان اہل علم اس میثاق کے مستند ہونے کے قائل ہیں۔

## معاہدے کی تحریر کی تاریخ

اس معاہدے کی تاریخ کے بارے میں قدیم مؤرخین و محدثین کے ہاں کوئی واضح اختلاف نہیں پایا جاتا۔ سب ہی اسے ہجرت مدینہ کے فوری بعد اور غزوہ بدر سے پہلے کا معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ امام ابوعبید کہتے ہیں:

> ہماری رائے میں یہ معاہدہ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے آغاز کے وقت کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کو استحکام و غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس وقت تک اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم صادر ہوا تھا۔ یہ (مدینہ کے) اہل کتاب تین گروہوں پر مشتمل تھے۔ بنو قینقاع، بنونضیر اور بنو قریظہ۔(5)

دور جدید کے اہل علم نے میثاقِ مدینہ کی تاریخ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ولہاوزن اور کیتانی اسے غزوہ بدر سے پہلے کی دستاویز گردانتے ہیں۔ مجید خدوری بڑے یقین سے اسے غزوہ بدر سے پہلے کی دستاویز قرار دیتے ہیں۔(6) پروفیسر منٹگمری واٹ نے اس ضمن میں فکر انگیز بحث کی

ہے اور اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ معاہدہ بنو قریظہ کے خاتمے کے بعد کیا گیا ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ سب تخمین و ظن ہی ہے۔[7] ڈاکٹر حمید اللہ نے معاہدے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا پہلا حصہ غزوہ بدر سے پہلے کا ہے اور دوسرا حصہ غزوہ بدر کے بعد کا۔ آپ نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور مضبوط عقلی دلائل دیئے ہیں لیکن قدیم مآخذ سے کوئی واضح حوالہ نہیں دیا۔[8]

مقالہ نگار کی رائے میں یہ معاہدہ مکمل طور پر غزوہ بدر سے پہلے ہی لکھا گیا۔ بنو قینقاع جو اس معاہدے کے ایک فریق تھے، انہیں غزوہ بدر کے ایک ہی ماہ بعد اس معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر مدینے سے نکال دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

**قال ابن اسحاق و حدثنی عاصم بن عمر بن قتادة۔ ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا مابینھم وبین رسول اللہﷺ وحاربوا فیما بین بدر و احد۔[9]**

ابن اسحاق نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کی کہ یہودیوں میں سب سے پہلے بنو قینقاع نے اس معاہدے کو توڑا جو ان کے اور آنحضورﷺ کے درمیان تھا اور انہوں نے غزوہ بدر اور اُحد کی درمیانی مدت میں لڑائی کی۔

اسی طرح کا بیان محمد ابن سعد کا بھی ہے۔[10] یہ عبارت اس بات کو پوری طرح سے واضح کرتی ہے کہ آنحضورﷺ نے یہ معاہدہ جملہ یہود سے، جن میں بنو قینقاع بھی موجود تھے، غزوہ بدر سے پہلے ہی کیا تھا۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ معاہدے کے متن میں باقاعدہ طور پر بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کا نام درج نہیں ہے تو اس کا ایک واضح جواب یہ ہے کہ ان قبائل کو اوس و خزرج کے حلفاء کی صورت میں معاہدے میں شریک کیا گیا۔ ان تینوں قبائل کا اوس و خزرج کے ساتھ حلیف ہونا مضبوط تاریخی شواہد سے ثابت ہے۔ ابن ھشام کی درج ذیل عبارت اس معاہدے پر خوب روشنی ڈالتی ہے:

**فکانوا اذا کانت بین الاوس والخزرج حرب خرجت بنو قینقاع مع الخزرج و خرجت النضیر والقریظة مع الاوس یظاھر کل واحد من الفریقین حلفاه، علی اخوانه۔**(11)

جب کبھی اوس و خزرج میں لڑائی ہوئی تو بنو قینقاع خزرج کے ساتھ نکلتے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ اوس کے ساتھ نکلتے اور ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے حلیف کی مدد کرتا تھا بمقابلہ اپنے بھائیوں کے۔

## میثاقِ مدینہ کا متن

ابن ھشام کی **کتاب السیرۃ** اور ابو عبید کی **کتاب الاموال** میں درج شدہ میثاقِ مدینہ چھوٹے بڑے ملے جلے فقروں پر مشتمل ہے۔ دورِ جدید کے اکثر علماء نے ان فقروں کو دستوری دفعات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ولھاوزن نے اس دستاویز کو سینتالیس (۴۷) دفعات پر منقسم کیا ہے۔ اکثر مغربی مؤرخین نے اسی تقسیم کو تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس دستاویز کی باون (۵۲) دفعات گنوائی ہیں لیکن ایسے قارئین کو جو یورپی مآخذ کا مطالعہ بھی کرتے ہیں الجھن سے بچانے کے لیے ان دفعات کی تعداد سینتالیس (۴۷) ہی رکھی ہے اور بعض بڑی دفعات کو الف اور ب دو اجزا پر تقسیم کر دیا ہے۔

یہ معاہدہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں تیئس (۲۳) دفعات ہیں اور دوسرے میں چوبیس (۲۴)۔ پہلا حصہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندہی کرتا ہے جب کہ دوسرا حصہ اہل اسلام اور یہود اور دیگر اھالیان مدینہ کے باہمی تعلقات، حقوق و فرائض اور دیگر اہم امور کی وضاحت کرتا ہے۔

مقالہ نگار کے نزدیک چونکہ صاحب کتاب **الاموال** امام ابو عبید القاسم بن سلام کا متن سب سے زیادہ مستند ہے اس لئے ذیل میں وہی درج کیا جاتا ہے۔

- یہ محمد نبی ورسول اللہ ﷺ کا عہد نامہ ہے جو قریشی اور مدنی مؤمنین و مسلمین کے درمیان نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کی پیروی کر کے ان میں اس طرح آملیں کہ ان کے ساتھ رہیں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں، یہ سب لوگ مل کر دوسرے لوگوں سے الگ ہو کر ایک جماعت قرار پائیں گے۔
- قریشی مہاجرین اپنے نظام قبیلہ کے مطابق باہم اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے۔ اسی طرح وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ اہلِ ایمان میں مروجہ دستور و انصاف سے ادا کریں گے۔
- بنو حارث بن خزرج اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین میں مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔
- بنو ساعدہ اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین کے مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔
- بنو جشم اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین کے مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔
- بنو نجار اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین کے مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔
- بنو عمرو بن عوف اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین کے مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔
- بنو نبیت اپنے نظام کے مطابق اپنی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین کے مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔
- اور بنو اوس اپنے نظام کے مطابق اپنی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مؤمنین کے مروجہ دستور و انصاف سے دے گا۔

- مؤمنین اپنے کسی زیر بار قرض دار کو بے یار و مدد گار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدہ کے مطابق فدیہ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے اور یہ کہ مؤمنین متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو ان میں سے مؤمنوں کے درمیان ظلم، گناہ، زیادتی، سرکشی اور فساد و بغاوت کا موجب ہو گا۔ وہ سب اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے خواہ وہ ظالم ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔
- کوئی مؤمن کسی مؤمن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کرے گا اور نہ مؤمن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا۔
- اہلِ ایمان دوسرے لوگوں سے الگ آپس میں ایک دوسرے کے مدد گار و کارساز ہوں گے۔
- یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا تابع ہو جائے گا اس کے ساتھ دستور کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور انصاف و مساوات کا سلوک رکھا جائے گا، ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔
- مؤمنین کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی مؤمن قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مؤمن سے الگ ہو کر صلح نہیں کرے گا، اسے مسلمانوں کے درمیان مساوات و عدل ملحوظ رکھنا ہو گا۔ ہر غازی جماعت کے افراد آپس میں ایک دوسرے کے جانشین ہوں گے۔
- متقی مؤمنین اس معاہدے کی شرائط پر کاربند رہیں گے۔
- کوئی مشرک قریش کے مال کو پناہ نہیں دے گا اور نہ ہی کسی مؤمن کے مقابلے میں وہ (مشرکین) قریش کی مدد کرے گا۔
- جو کسی مؤمن کا ناحق خون کرے گا اسے مقتول کے بدلے قتل کیا جائے گا الا یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے بدلے خون بہا لینے پر رضامند ہو جائے اور تمام مؤمن قاتل کے خلاف رہیں گے۔
- کسی مؤمن کے لئے جو اس معاہدے کی پابندی کا اقرار کر چکا ہے یا اللہ اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہے یہ جائز نہ ہو گا کہ وہ کسی قانون شکن کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ جو ایسے

مجرم کی مدد کرے گا یا پناہ دے گا تو اس پر قیامت کے دن تک اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب ہو گا، اس سے توبہ قبول کی جائے گی اور نہ ہی فدیہ۔

- اور تم لوگ (مؤمن) جب بھی کسی معاملہ میں باہم اختلاف کرو گے تو اس کے فیصلے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع ہو گا۔
- مؤمنین جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے۔
- بنی عوف کے یہود بذات خود اور اپنے حلفاء و موالی کے ساتھ مل کر مؤمنین میں سے ایک جماعت ہوں گے۔([12]) یہودی اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور مؤمنین اپنے دین پر البتہ جس نے ظلم و گناہ کیا وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی میں ڈالے گا۔
- بنی نجار کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ مراعات ہیں جو بنی عوف کے یہودیوں کے لئے ہیں اور بنی حارث کے یہودیوں کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہودیوں کے لئے ہے۔ بنی جشم کے یہود کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہے اور بنو ساعدہ کے یہود کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہے۔ اور اوس کے یہود کے لئے بھی وہی کچھ ہے جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہے۔ لیکن جس نے ان میں سے ظلم و زیادتی کی تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی میں ڈالے گا۔
- اور ان قبائل میں سے کوئی فرد محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر (مدینہ سے) باہر نہیں نکلے گا۔
- اس معاہدے کے شرکاء سے جو جنگ کرے تو تمام شرکاء اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے اور ہر حال میں مظلوم کی مدد کریں گے۔
- اس معاہدے والوں کے لئے مدینہ کی حدود میں داخلہ علاقہ حرم کی حیثیت رکھے گا۔

- اس معاہدے والوں کے درمیان جو بھی نیا معاملہ یا قانون شکنی کا واقعہ پیش آئے گا جس سے نقصان اور فساد کا امکان ہو تو اس کے فیصلے کے لئے اللہ اور محمد نبی ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔
- جو یثرب (مدینہ) پر یلغار کرے گا تو یہ معاہدہ کرنے والے باہمی امداد سے اس کا جواباً مقابلہ کریں گے۔
- ان (مسلمانوں) میں سے جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لئے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کر لیں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) ہمیں کسی ایسی ہی صلح کی دعوت دیں تو مؤمنین بھی اس دعوت کو قبول کریں گے۔ ہاں اگر وہ حلیف دین (اسلام) سے بر سر پیکار ہوں تو اس سے صلح نہیں کی جائے گی۔
- اخراجات میں تمام لوگ اپنے اپنے حصے کے ذمے دار ہوں گے۔
- اوس (قبیلہ) کے یہود بذاتِ خود اور ان کے حامی وحلفاء اس عہد نامہ پر خوبی وعمدگی سے عمل پیرا ہونے والوں کے ساتھ رہیں گے۔
- گناہ کی حدود سے ورے نیکی اور وفاداری ہے۔ ہر کام کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہو گا۔ زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا۔
- اس معاہدہ پر سچائی اور نیکی سے کاربند رہنے والوں (کی پشت) پر اللہ ہے۔
- یہ معاہدہ ظالم اور گناہ گار کو اس کے عمل بد کے انجام سے نہیں بچائے گا۔ جو (مدینے سے) باہر نکل جائے وہ مامون رہے گا اور جو (مدینہ) میں بیٹھا رہے گا وہ بھی مامون ہو گا لیکن جو ظلم وگناہ کرے گا وہ مامون نہیں رہے گا۔
- اس معاہدے کے (پابند کہلانے کے) زیادہ مستحق وہی ہوں گے جو نیکوکار اور وفادار ہوں گے۔([13])

## میثاقِ مدینہ کی اہمیت وافادیت

میثاقِ مدینہ کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی اہمیت وافادیت کے بارے میں جو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اس معاہدے کی بدولت مدینے کی شہری ریاست کا آغاز ہوا اور آنحضور ﷺ اس ریاست کے سربراہ تسلیم کرلئے گئے اور آپ ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہوگئے۔ بقول جسٹس امیر علی یہ معاہدہ آپ کی عظمت کی ایک واضح دلیل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بقول ایک معروف مستشرقین میور صرف اپنے دور کے ہی عظیم ترین انسان نہیں تھے بلکہ آنے والے تمام زمانوں کی عظیم ترین ہستی تھے۔ آپ نے ایک عظیم مدبر حاکم اور سیاست دان کی طرح مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ اور آپس میں منتشر لوگوں کو متحد اور یکجا کرنے کا کام بڑی مہارت سے سرانجام دیا۔ آپ ایک ریاست، ایک کامن ویلتھ اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے جو بین الاقوامی اصولوں پر مبنی تھا۔(14)

۲۔ اس دستاویز کی بدولت سرکار دو عالم ﷺ نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اختیارات اپنے لئے محفوظ کرلئے۔

۳۔ آنحضور ﷺ نے سیاست میں اخلاقی عناصر کو داخل کیا۔ اصل سرچشمہ اقتدار اللہ تعالیٰ کو قرار دیا اور خود اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت اختیار کی۔

۴۔ شہریت، تنظیم حکومت، سیاسی رواداری، فراست، اور حکمت عملی کا اظہار بھی اسی معاہدے سے ہوا۔

۵۔ اس معاہدے کی بدولت مذہبی آزادی کا اصول وضع ہوا۔ نیز جن بنیادوں پر غیر مسلموں سے اتحاد و تعاون ہوسکتا ہے اسی کی نشاندہی ہوئی۔

۶۔ اس معاہدے نے اہل اسلام کے باہمی حقوق و فرائض اور جملہ شہریوں کے آپس میں تعلقات، فرائض اور حقوق کا تعین کیا۔

۷۔ اس معاہدے نے ظلم، ناانصافی، عدم مساوات اور ایسی ہی دیگر خرابیوں کا سدِ باب کیا۔ عربوں کے قتل کا بدلہ لینے کا پرانا انفرادی طریقہ ختم کر کے اسے اجتماعی فریضہ قرار دیا۔

۸۔ کمزوروں، ناداروں اور مظلوموں کی دادرسی کا پورا پورا اہتمام بھی اسی معاہدے کی رو سے ہوا۔

۹۔ حالت امن اور حالت جنگ کا لائحہ عمل مرتب ہوا۔

۱۰۔ یہ معاہدہ قریش کے خلاف ایک مشترکہ اتحاد بن گیا اور دشمنان اسلام کا داخلہ مدینہ میں بند کر دیا گیا۔

۱۱۔ مدینہ کو حرم قرار دیا گیا۔ یوں اس نئی شہری ریاست کی حرمت قائم ہوئی اور اس کے داخلی امن اور تحفظ و دفاع کا خاطر خواہ انتظام ہوا۔

۱۲۔ قبائل کی باہمی خانہ جنگی کا انسداد بھی اسی معاہدے کی بدولت ہوا۔

۱۳۔ یہ معاہدہ ہی اہل اسلام کے بڑے دشمن مشرکین مکہ اور دوسرے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوا۔

۱۴۔ اسی معاہدہ نے شہریوں کے اندر قانون، اخلاق، مذہب اور انسانی قدروں کے احترام کا بھرپور جذبہ پیدا کیا۔

۱۵۔ اور پھر اسی معاہدے نے اللہ تعالیٰ کے احکام اور آنحضور ﷺ کے فرامین کو حتمی اور فائق حیثیت دے دی۔

ہادی دو جہاں ﷺ کے جاری کردہ اسی نظام کی بدولت ایک مضبوط اسلامی ریاست اور ایک صالح معاشرہ معرض وجود میں آیا۔ یہ بے نظیر نظام قیامت تک اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے اصول وضوابط کی تنقید کے لیے عدیم النظیر نمونہ قرار پایا۔

# حوالے وحواشی

[1]۔ حوالے کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر حمید اللہ، **دی فرسٹ رٹن کانسٹٹیوشن ان دی ورلڈ**، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۴۔۹

[2]۔ ابو عبید القاسم بن سلام، **کتاب الاموال**، اسلام آباد، س۔ن، ۱/ ۳۰۹

[3]۔ **کتاب الاموال**، ۱/ ۳۶۴

[4]۔ المقریزی، **امتاع الاسماع**، طبع مصر، ۱/ ۴۹، ۱۰۴، ۱۰۷بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ، **دی فرسٹ رٹن کانسٹٹیوشن**، ص۳۹۔۴۰، ۶۸

[5]۔ **کتاب الاموال**، ۱/ ۳۶۴

[6]۔ مجید خدوری، **War and Peace in the Law of Islam**، امریکہ، ۱۹۵۵ء، ص۲۰۶

[7]۔ ملاحظہ کیجئے منٹگمری واٹ، **Muhammad at Medina**، لندن، ۱۹۵۶ء، ص۲۳، ۲۷

[8]۔ ڈاکٹر حمید اللہ، **دی فرسٹ رٹن کانسٹٹیوشن (The First Written Constitution)**، ص۲۲۔۲۶

[9]۔ ابن ھشام، **السیرۃ النبویۃ**، مصر، ۱۹۳۶ء، ۳/ ۵۱

[10]۔ محمد ابن سعد، **طبقات**، بیروت، ۱۹۵۷ء، ۲/ ۲۹

[11]۔ ابن ھشام، **السیرۃ**، ۲/ ۱۸۸

[12]۔ عربی متن میں **امة من المؤمنين** اور بعض روایات کی رو سے **امة مع المؤمنين** کے الفاظ ہیں۔ بعض لوگوں نے **امت** کے وہ معنی مراد لینے کی دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے جو مسلمانوں میں اور خاص کر اردو میں ایک دینی اصطلاح کے طور پر معروف و مروج ہیں۔ اور جس کے دائرہ میں حلقہ بگوشاں اسلام کے سوا کوئی دوسرا فرد یا گروہ نہیں آتا۔ اردو میں اس

فقرے کا ترجمہ مؤمنین کی ایک امت جیسے فقروں سے کرنا درست نہیں، عربی میں امت کے ابتدائی معنی جماعت گروہ یا ایک ہیئت اجتماعیہ کے ہیں۔ حتیٰ کہ پرندوں اور بعض جانوروں کی نوع کے لئے بھی امت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اس فقرے میں امت کے معنی محض جماعت یا گروہ کے ہیں۔ میثاق مدینہ میں دفاع اور شہری زندگی کی دیگر ضروریات کے لئے یہود کو مسلمانوں کے ساتھ شامل کر کے ایک طبقہ یا گروہ قرار دیا گیا ورنہ دینی پہلو سے الگ ہونے کا ذکر خود اسی شق کے اندر موجود ہے جس کے بعد دوسرے مفہوم کے لئے قطعاً گنجائش باقی نہیں رہتی۔

[13]۔ کتاب الاموال (ترجمہ)،۱/ ۳۵۹۔۳۶۵

[14]۔ حوالے کے لئے ملاحظہ کیجئے، سید امیر علی، The Spirit of Islam، کراچی، ۱۹۴۹ء، ص ۵۸

★★★★★

*ڈاکٹر امان اللہ خان

# اسلامی ثقافت کے بنیادی عوامل

مضمون پیش نظر میں ثقافت سے مراد وہ اعلیٰ نظریات، بلند نصب العین اور معاشرتی و اخلاقی اقدار ہیں جن کی بدولت کوئی قوم یا ملت اپنی ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ حالت سے نکل کر تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج کی تحصیل کرتی ہے۔ ثقافت کی اس تعریف کی روشنی میں جب ہم اسلامی ثقافت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر اس کی امتیازی حیثیت کا پتہ چلتا ہے اور واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس ثقافت کی بنیاد تمام تر قرآنِ حکیم اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات پر ہی رہی ہے۔ انھی تعلیمات سے مسلمانوں نے تمام زمانوں میں نئی روح اور حیات تازہ حاصل کی ہے۔ مسلمانان عالم نے آداب و اخلاق میں، نظام منزل کی استواری میں، باہمی معاملات کی درستگی میں، علومِ نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل و اشاعت میں، سیاست و معیشت میں، عبادات میں، غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں انھی سے ہدایت ورہنمائی حاصل کی ہے اور اسلامی تہذیب کی عظیم الشان عمارت انھی کی اساس پر قائم ہوئی ہے۔

---

* مجلہ بزم اقبال، اقبال، کلب روڈ، لاہور، اپریل ۱۹۶۶ء، ص ۵۵-۶۵

اسلامی تعلیمات کے وہ عوامل جنہیں اسلامی ثقافت کی اہم بنیادیں قرار دیا جا سکتا ہے، حسبِ ذیل ہیں:

| | |
|---|---|
| ۱۔ توحید و رسالت | ۲۔ وحدت نسل انسانی |
| ۳۔ عزت نفس انسانی | ۴۔ اخوت بین المسلمین |
| ۵۔ عدالت | ۶۔ رواداری |
| ۷۔ قیام امن | ۸۔ طلب علم |
| ۹۔ عمل صالح | ۱۰۔ عبادات |
| ۱۱۔ منزلی زندگی کی استواری | ۱۲۔ باہمی معاملات کی استواری |
| ۱۳۔ متوازن نظام معیشت کا قیام | ۱۴۔ سیاسی تنظیم |
| ۱۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تعلیم | |

۱۔ **توحید و رسالت:** اسلامی تعلیمات میں توحید الٰہی کا تصور مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم میں توحید کا بیان جابجا پھیلا ہوا ہے، خصوصاً مکی سورتوں کا معتدبہ حصہ تو توحید کی تعلیم ہی پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم نے اسی کو تمام نبیوں کی تعلیم کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم نے انسان کو ایک ایسے علیم، حکیم، حیی و قیوم خدا کا تصور دیا ہے جو کائنات کا خالق و مالک، جہانوں کا پالنے والا، انسانوں کا قانونی و سیاسی حاکم، ان کے احوال سے پوری طرح واقف، ان کی شاہ رگ سے زیادہ قریب، ایسا رحیم و کریم کہ اس کی رحمت تمام دوسری چیزوں پر فائق، وحدہ لاشریک خدا جو نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا۔ توحید کی وضاحت کے سلسلے میں قرآن حکیم کا انداز بڑا پر حکمت، بااثر اور انسانی فہم و فطرت کے عین مطابق ہے۔ کہیں انسانوں کو زمین و آسمان کی تخلیق، لیل و نہار کی گردش، موسموں کے تسلسل، اجرام سماوی کے نظام حرکات۔ غرضیکہ پوری کائنات میں ایک کامل تنظیم ہونے پر غور و تدبر کی تلقین کرتے ہوئے انہیں ایک خدا کی طرف بلایا ہے۔ کہیں عقلی استدلال سے یہ بات سمجھائی ہے کہ اگر اس کائنات کے دو خدا

ہوتے تو اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا اور کہیں شرک کو سب سے بڑا اور ناقابل معافی گناہ قرار دیتے ہوئے انسانوں کو بتوں اور جھوٹے خداؤں کی پرستش سے روکا اور بڑے موثر پیرائے میں سمجھایا ہے کہ پتھر کے ٹکڑے جو کسی کو نفع وضرر نہیں پہنچا سکتے معبود کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

اسلام نے بنی نوع انسان کو محض نظری توحید ہی کا سبق نہیں دیا بلکہ ایک ایسی عملی توحید کی تلقین کی ہے جو ان کے اعمال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس ضمن میں ناامیدی، خوف اور حزن جیسے سلبی و تخریبی جذبات سے انسان کو روکا ہے۔ چنانچہ یہ جذبہ توحید ہی تھا جس سے سرشار ہو کر مسلمان کائنات کی تسخیر میں لگ گئے، تکالیف ومصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور اپنے آہنی عزائم کی بدولت حوادث کا رُخ پھیر دیا۔

اسلام انبیائے سابقہ کی رسالت پر عمومی طور پر اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر خصوصی طور پر ایمان کو ضروری قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم نے مختلف طریقوں سے رسول اکرم ﷺ کی کامل اطاعت اور پیروی کو ضروری قرار دیا ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا تو کہیں رسول ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت شمار کیا ہے۔ کہیں مسلمانوں کو اپنے تمام معاملات میں رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کو آخری حکم و معیار تسلیم کر لینے کی تلقین کی ہے تو کہیں ان کی ذات کو پوری امت مسلمہ کے لیے کامل نمونہ حیات قرار دیا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے ہر دور اور ہر زمانے میں رسول اکرم ﷺ کی پیروی اور اطاعت کو فریضہ سمجھتے ہوئے ان کے اسوہ حسنہ کو مکمل نمونہ زندگی سمجھا ہے اور بیک وقت ان کی ذات اور تعلیمات سے روشنی اور ہدایت حاصل کی ہے۔ مسلمانوں کی اس فضیلت میں دنیا کی کوئی قوم شریک نہیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کی تعلیم اور اس کے اقوال و افعال کو انتہائی احتیاط اور چھان بین سے محفوظ کر لینے کے سلسلے میں تقریباً چھ لاکھ انسانوں کی زندگیوں کو محفوظ کر لیا ہو۔

**۲۔ وحدت نسل انسانی:** رنگ، نسل، زبان اور علاقائی امتیازات کو ختم کرنے کے لیے، نیز تمام انسانوں کے اندر ہمدردی اور مساوات کا جذبہ ابھارنے کے لیے اسلام نے وحدت نسل انسانی کی تعلیم دی ہے اور یہ واضح کر دیا کہ اس دنیا میں بسنے والے تمام انسان بحیثیت انسان برابر ہیں کیوں کہ ان کی اصل ایک ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

**يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٖ وَٰحِدَةٖ وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالٗا كَثِيرٗا وَنِسَآءٗۚ** (1)

اے لوگو! اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کیے رہو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان سے مرد وعورت پھیلائے۔

شعوب و قبائل کے امتیاز سے بالاتر ہو جانے اور تقویٰ کو معیار شرافت و تکریم گردانے کے سلسلے میں ارشادِ ربانی ہے:

**وَجَعَلۡنَٰكُمۡ شُعُوبٗا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓاْۚ إِنَّ أَكۡرَمَكُمۡ عِندَ ٱللَّهِ أَتۡقَىٰكُمۡۚ**(2)

اور ہم نے تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تعارف کے لیے تقسیم کیا ہے۔ تحقیق اللہ کے نزدیک مکرم و محترم وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

قرآن حکیم کی اسی قسم کی تعلیمات کے زیر اثر مسلمانوں نے نسلی، لسانی، لونی اور علاقائی امتیازات کو ہمیشہ ختم کرنے کی کوشش کی ہے اور ان اتفاقی امتیازات کی بناپر کسی انسان کے حقوق کو چھین لینے کو گناہِ عظیم سمجھا ہے۔

**۳۔ عزتِ نفس انسانی:** قرآن حکیم کی رو سے انسان کو تمام دیگر مخلوقات پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو خدا کے علاوہ تمام دوسری چیزوں کے سامنے جھکنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اسلام نے انسان کو پیدائشی طور پر گناہ گار نہیں بلکہ معصوم گردانا ہے اور اسے بڑا اعلیٰ وارفع مقام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو **لَقَدۡ خَلَقۡنَا ٱلۡإِنسَٰنَ فِيٓ أَحۡسَنِ**

تَقۡوِيمٖ(3) (یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے) کی فضیلت سے نوازا ہے اور بنی نوع انسان کی تکریم اور اس کے شرف کا ذکر کرتے ہوئے **وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ** (4) (اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے) ارشاد کیا ہے۔

قرآن حکیم انسان کو نیابت کی خلعت پہناتے ہوئے اسے ایک اعلیٰ امانت کا حامل اور مسجود ملائک بتاتا ہے۔ نیز **أَنَّ ٱللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ**(5)(تحقیق اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے) کی بلند تعلیم دے کر اسے کائنات کی غلامی سے نکال کر کائنات کی تسخیر کی دعوت دیتا ہے۔ عزت نفس انسانی کی اس قرآنی تعلیم نے اسلامی تہذیب کی ترقی و سربلندی میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اسی بناپر اقدارِ اعلیٰ کی تحصیل معاشرہ انسانی میں ایک صحت مندانہ انقلاب پیدا کرنے کا باعث بنی۔

**۴۔ اخوت بین المسلمین:** اسلام نے معاشرہ میں اتفاق، ہمدردی، ایک دوسرے کے لیے قربانی، محبت اور اخوت کے جذبات کی تلقین کی ہے اور اس سلسلے میں وہ تاریخ عالم میں لاثانی حیثیت کا حامل ہے۔ قرآن حکیم کا واضح ارشاد ہے:

**إِنَّمَا ٱلۡمُؤۡمِنُونَ إِخۡوَةٞ** (6)

بے شک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اور حکم ربانی ہے:

**وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ إِذۡ كُنتُمۡ أَعۡدَآءٗ فَأَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوبِكُمۡ فَأَصۡبَحۡتُم بِنِعۡمَتِهِۦٓ إِخۡوَٰنٗا** (7)

اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جو تم پر ہیں کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کی نوازش سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔

رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ اور پیہم تلقین نے دنیا کے تمام مسلمانوں کو رنگ، زبان،

نسل، علاقے اور دیگر تفریقوں سے بالاتر رکھتے ہوئے ایک رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا اور یہ واضح کر دیا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمانوں کی جان، مال، آبرو اور مفاد کی حفاظت اسی طرح واجب ہے جس طرح اپنے حقیقی بھائی کی۔ مسلمانوں کے اس جذبہ اخوت کا نظارہ ہر سال حج کے موقع پر بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

**۵۔ عدالت:** قرآن حکیم نے بالتکرار اس امر پر زور دیا ہے کہ انصاف ہر قسم کی جانبداری سے پاک ہونا چاہیے خواہ فیصلے کی زد منصف کے اپنے عزیز، والدین یا اس کی اپنی جماعت ہی پر پڑتی ہو۔ اسلامی ریاست میں کوئی فرد خواہ وہ اس کا منتخب سربراہ ہی کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم کی متعدد آیاتِ کریمہ اس پر شاہد ہیں:

ا۔ **إِنَّ ٱللَّهَ يَأۡمُرُ بِٱلۡعَدۡلِ وَٱلۡإِحۡسَٰنِ**(8)

بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

ب۔ **وَإِذَا قُلۡتُمۡ فَٱعۡدِلُواْ وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبَىٰۖ وَبِعَهۡدِ ٱللَّهِ أَوۡفُواْۚ** (9)

اور جب تم بات کیا کرو تو انصاف کیا کرو گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا کرو پورا کیا کرو۔

ج۔ **يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُونُواْ قَوَّٰمِينَ بِٱلۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلَّهِ وَلَوۡ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمۡ أَوِ ٱلۡوَٰلِدَيۡنِ وَٱلۡأَقۡرَبِينَۚ** (10)

اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔

د۔ **وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَـَٔانُ قَوۡمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعۡدِلُواْۚ ٱعۡدِلُواْ هُوَ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰۖ**(11)

اور کسی گروہ کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

**٦۔ رواداری:** دیگر مذاہب کے متعلق اور اقلیتوں کے بارے میں اسلامی موقف نہایت واضح ہے۔ اسلامی معاشرہ میں مذہب وعقیدہ کی پوری آزادی ہے۔ قرآن حکیم میں تمام انبیاء کا خواہ ان کا نام لیا گیا ہے یا نہیں ایک سا احترام کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسلامی ریاست اس امر کی پابند ہے کہ وہ تمام اقلیتوں کی جان، مال، آبرو وغیرہ کے تحفظ کا مکمل اہتمام کرے۔ مذہب کے معاملے میں زبردستی اور جبر واکراہ کے استعمال سے سختی سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

ا۔ **لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ** (12)

دین میں زبردستی جائز نہیں۔

ب۔ **أَفَأَنتَ تُكۡرِهُ ٱلنَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُواْ مُؤۡمِنِينَ** (13)

سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان ہی لے آئیں؟

ج۔ **فَإِنۡ أَعۡرَضُواْ فَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيظًاۖ إِنۡ عَلَيۡكَ إِلَّا ٱلۡبَلَٰغُۗ** (14)

پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو ہم نے آپ کو ان پر نگران کر کے نہیں بھیجا۔ آپ کے ذمے تو صرف (حکم کا) پہنچا دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے تئیں رب العالمین اور رحمان اور رحیم ہونے کا اعلان کیا ہے وہاں رسول اکرم ﷺ کو رحمۃ للعالمین کا خطاب دے کر پوری نسل انسانی سے مسلمانوں کے رحیمانہ سلوک کی نشاندہی بھی کی ہے۔

**٧۔ قیام امن:** امن کا مفہوم تو لفظ اسلام کے مادے میں موجود ہے۔ جو اسلام کے پیغام کو قبول کرتا ہے وہ خود بھی امن میں آجاتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی امن کا محافظ بن جاتا ہے۔

مسلمانوں کو ایک ایسے رحیم و کریم اور سلامتی پسند کرنے والے اللہ کا تصور دیا گیا ہے جو دنیا میں امن و امان کو پسند اور فساد و خون ریزی کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کی رحمت تمام چیزوں پر سبقت لے گئی ہے اور وہ تمام انسانوں کو انتہائی شفقت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ پیغمبر اسلام جو اس دنیا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے تشریف لائے تھے ایک رحیم و کریم، نرم دل، صلح پسند، امن کے داعی اور افراد بنی آدم کے لیے انتہائی ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھنے والے انسان تھے اور دوسروں کو ان کی تلقین بھی یہی تھی۔ الغرض اسلام ہر لحاظ سے دنیا میں امن و سلامتی کا علم بردار ہے۔

**۸۔ طلب علم:** اسلام میں علم کے حصول کو فریضہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں جابجا اہل علم اور ارباب فہم و ذکا کی برتری کا ذکر کیا گیا ہے اور انسان کو علم کے حصول کی رغبت دلائی گئی ہے۔

کہیں علم کی فوقیت وبرتری کو **قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي ٱلَّذِينَ يَعۡلَمُونَ وَٱلَّذِينَ لَا يَعۡلَمُونَۗ**(15) (کیا علم والے اور جو علم نہیں رکھتے کہیں برابر ہوتے ہیں؟) کہ کر واضح کیا گیا ہے اور کہیں **يَرۡفَعِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡعِلۡمَ دَرَجَٰتٖۚ** (16)(اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا درجے بلند کرے گا) فرما کر اہل علم کے درجات کی بلندی کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہیں خود رسول اکرم ﷺ کو **وَقُل رَّبِّ زِدۡنِي عِلۡمٗا**(17) (کہ اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرمائیں) کی تلقین سے اہل علم پر علم کے حصول کی اہمیت و ضرورت کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسی ضمن میں انسان کو عقل استعمال کرنے، تدبر سے کام لینے اور کائنات میں غور و فکر کرنے کی بھی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام نے خود علم کی ضرورت اور اس کی برتری و فضیلت پر بڑا زور دیا ہے۔ آپ ﷺ کے ارشادات میں سے ہے:

ا۔ **العلماء ورثة الانبیاء** (علماء انبیاء کے وارث ہیں)(18)؛

ب۔ فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر على سائر الكواكب (عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت دوسرے تمام ستاروں پر) ([19])

**۹۔ عمل صالح:** اسلام کی ایک نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عمل صالح کے لیے جدوجہد کی تلقین کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خدائے بزرگ وبرتر انسانی زندگی کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

**خَلَقَ ٱلْمَوْتَ وَٱلْحَيَوٰةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًاۚ وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْغَفُورُ**([20])

موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔

اسلام کی نظر میں ہر انسان اپنی اپنی جگہ پر ذمہ دار ہے اور کوئی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

**وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰۚ**([21])

اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔

اور یہ کہ

**لَّيْسَ لِلْإِنسَٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ** ([22])

یعنی انسان کو اس کی کوشش اور سعی کے عوض ہی اچھا اجر ملے گا۔

پس اسلام کی نگاہ میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا دارومدار اس کے عمل صالح پر ہے۔ اگر وہ اچھے اعمال سے انفرادی، منزلی اور اجتماعی طور پر مقصد حیات کے تقاضوں کو پورا کرے گا اور عمدہ معاشرہ قائم کرنے میں مدد ومعاون ہو گا تو اللہ اسے دونوں جہانوں میں کامیاب

کرے گا۔ لیکن اگر وہ سیدھے راستے سے ہٹ کر گمراہی میں جا پڑے گا اور برے کاموں کا ارتکاب کر کے معاشرہ انسانی میں فساد برپا کرنے کا موجب بنے گا تو وہ اپنے بلند مقام سے گر جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے عتاب و عذاب کا مستحق بن جائے گا۔

**۱۰۔ عبادات:** اسلام نے انسان کی روحانی پاکیزگی کے لیے، اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے مضبوط کرنے کے لیے، اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار کی تحصیل کے لیے، معاشرہ میں مساوات و اخوت اور تنظیم کے جذبات پختہ تر کرنے کے لیے اور دیگر بہت سے مقاصد اعلیٰ کے حصول کے لیے عبادات کا ایک موثر نظام مرتب کیا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کر کے انسان دینی و دنیوی فلاح و بہبود حاصل کر سکتا ہے۔

**۱۱۔ منزلی زندگی کی استواری:** معاشرے کی ترقی و استحکام کے لیے اسلام ضروری سمجھتا ہے کہ افراد کی گھریلو زندگی بھی پر سکون، باسلیقہ اور منظم ہو۔ اسی لیے قرآن حکیم اور رسول اکرم ﷺ کی احادیث میں ایک اعلیٰ درجہ کے نظام منزل کے قیام کی تعلیم دی گئی ہے اور مرد، عورت اور بچوں کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔ نکاح، مہر، نان و نفقہ، وراثت، طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل پر واضح احکام دیئے گئے ہیں۔ اسلام نے مرد اور عورت کے باہمی رشتہ کو باعث سکون و مؤدت اور رحمت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنۡ ءَايَـٰتِهِۦۤ أَنۡ خَلَقَ لَكُم مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ أَزۡوَٰجً۬ا لِّتَسۡكُنُوٓاْ إِلَيۡہَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُم مَّوَدَّةً۬ وَرَحۡمَةًۚ (23)

اور یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہارے جوڑے پیدا کئے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو، اور تمہارے درمیان مودّت اور رحمت پیدا کی۔

بنی نوع انسان پر اسلام کا یہ خاص احسان ہے کہ اس نے عورت کو ایک بلند اور باعزت مقام عطا کیا ہے۔ عورت بحیثیت ماں، بہن، بیوی، بیٹی غرضیکہ ہر حالت میں قابل احترام ہے۔ اسلامی

معاشرے میں جہاں ٱلرِّجَالُ قَوَّٰمُونَ عَلَى ٱلنِّسَآءِ [24] (مرد عورتوں کے قوام ہیں) کی تعلیم کے تحت مرد کو منتظم اور مدبر کی حیثیت حاصل ہے وہاں يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً [25] (اے لوگو! اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کیے رہو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان سے مرد و عورت پھیلائے) کے تحت مرد و عورت حقوق میں برابر قرار دیئے گئے ہیں۔ اسلام نے وَلَهُنَّ مِثۡلُ ٱلَّذِي عَلَيۡهِنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِ [26] (اور ان پر (عورتوں) کے حقوق ہیں ویسے ہی جیسے ان پر (مردوں) کے حقوق ہیں) کی تعلیم دے کر عورتوں کے حقوق اور ان کے منصب کی حفاظت کی ہے۔

منزلی زندگی کی استواری کے ضمن میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

**خیر کم خیر لا هله** [27]

تم میں سے بہترین وہ ہے جو اہل و عیال کے لیے بہترین ہے۔

یہ فرمانِ رسول ﷺ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ایک اسلامی گھرانے کا نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیتا ہے۔

**۱۳۔ ایک متوازن نظام معیشت:** اسلام ایک ایسے متوازن نظام معیشت کا حامی ہے جو افراط و تفریط سے بچا ہوا ہو۔ نہ تو اس میں افراد کو اپنی محنت سے اکٹھی کی ہوئی ملکیت سے ہی محروم کر دینے کی اجازت ہے کہ وہ مشکل اور تنگ دستی میں زندگی کے دن کاٹیں اور نہ یہ کہ وہ بغیر محنت کے عیش و عشرت میں مگن رہیں اور دولت پر سانپ کی طرح بیٹھے رہیں۔ اسلام نے ان دو انتہاؤں کو ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اصول و تدابیر عطا فرمائیں:

ا۔ **زکوٰۃ:** ہر سال صاحب مال لوگ اپنے سرمائے سے ایک مقررہ رقم ضرورت مند لوگوں کے لیے نکالیں۔

ب۔ **انفاق فی سبیل اللہ:** اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ضرورت مندوں کے لیے خرچ کیا جائے۔ اس کا دائرہ زکوٰۃ کے دائرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے کیوں کہ یہ سرمائے کا وہ حصہ ہے جو خوشی سے خدا کی راہ میں سماجی و قومی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کیا جاتا ہے۔

ج۔ **سرمایہ کو مفید کاموں میں لگانا:** اسلام اکتناز یعنی سرمایہ کو جمع کر کے رکھ لینے اور اسے قومی دولت میں اضافے کے لیے یا خود نفع حاصل کرنے کے لیے کام میں نہ لگانے کے خلاف ہے۔ قانون کی رو سے ایسا سرمایہ جو کام میں نہ لایا جائے اور دبا کر رکھ لیا جائے قابل ضبط ہے۔

د۔ **سود کی ممانعت:** سود چونکہ ضرورت مند لوگوں کی معاشی حالت کو تباہ کرنے والا اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی حوصلہ افزائی کرنے والا ہے اسلام میں خاص طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح سے اسلام ناجائز ذخیرہ اندوزی، جوا، سٹہ، سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ سے روکتا ہے اور اسراف یعنی حد سے زیادہ خرچ کرنے یا کنجوسی سے روکتا ہے اور اس طریقے سے سرمایہ جمع کرنے کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

**۱۴۔ سیاسی تنظیم:** ایک اعلیٰ درجہ کی سیاسی تنظیم کے لیے اسلام نے نہایت قابل قدر اصولوں کی تلقین کی ہے۔ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

ا۔ **اللہ تعالیٰ کی حاکمیت:** جدید جمہوری نظریات کے برعکس اسلام سیاسی و قانونی حاکمیت کا حق فقط اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کرتا ہے اور صرف اور صرف اسے ہی کل کا مالک اور قانون دینے والا سمجھتا ہے۔ حاکمیت اعلیٰ کے اس نظریے کے تحت اسلامی نظام سیاست سے آمریت اور مطلق العنانیت قطعی طور پر خارج ہو جاتے ہیں۔

ب۔ **اطاعتِ رسول ﷺ:** اللہ تعالیٰ کا پیغام بنی نوع انسان تک پہنچانے والے رسول اور نبی ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن حکیم نے سب پیغمبروں کا احترام کرنے کی تعلیم دی ہے اور آخری رسول محمد ﷺ کی، جو ایک کامل دین اور شریعت لے کر بنی نوع انسان کی

اصلاح اور فلاح و بہبود کے لیے تشریف لائے، مکمل پیروی اور اطاعت کی صرف تلقین ہی نہیں بلکہ ان کی اطاعت و پیروی کو فرض قرار دیا۔ اسی لیے ایک اسلامی مملکت کی انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ، نیز اس مملکت کی مسلمان آبادی سنت رسول ﷺ کے خلاف عمل کرنے کی مجاز نہیں۔

ج۔ **خلافت:** فرمانِ الٰہی: **وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ كَمَا ٱسۡتَخۡلَفَ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِمۡ**([28]) [تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین پر خلافت عطا فرمائے گا] کی رو سے قرآن حکیم حکومت کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے اسے خلافت کا نام دیتا ہے اور اس کی نیابتی حیثیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ قرآن اس خلافت کا حق دار کسی ایک شخص یا خاندان کو نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ کو قرار دیتا ہے۔ اس طرح اسلامی ریاست عوام و خواص کو حکومت میں شریک کرنے کے لیے جدید جمہوری نظام سے بھی زیادہ پیش پیش ہے۔

د۔ **شوریٰ کا اصول:** فرمانِ الٰہی: **وَأَمۡرُهُمۡ شُورَىٰ بَيۡنَهُمۡ** ([29]) (اور ان کے امور باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) کی تعلیم نظام سیاست میں باہمی مشورے کی اہمیت کو وضاحت کرتا ہے۔ اسلام میں باہمی مشورے کو اتنا اہم گردانا گیا ہے کہ خود پیغمبر خدا ﷺ کو جو بوجہ خدا سے وحی کا رشتہ رکھنے کے لوگوں کے مشورے کے محتاج نہیں تھے، حکم ہوتا ہے کہ وہ امور میں ان سے مشورے کیا کریں۔ ارشاد ہوتا ہے: **وَشَاوِرۡهُمۡ فِي ٱلۡأَمۡرِ**([30])۔ مجلس شوریٰ کی کوئی معین شکل البتہ اسلام نے متعین نہیں کی اور اسے امت مسلمہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

ان اصولوں کے علاوہ ایک اعلیٰ نظام عدل کا قیام، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا اہتمام،

شخصی آزادی و حقوق کا تحفظ، انفرادی ملکیت کا احترام، بین الاقوامی معاملات کی استواری اور معاہدوں کا احترام، عبادات کی تنظیم اور ریاست میں بسنے والے انسانوں کی ہر قسم کی فلاح و بہبود کا اہتمام بھی اسلامی نظام سیاست کے اہم پہلو ہیں۔

**۱۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تعلیم:** اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے تبلیغ دین کا بھی ایک جامع نظام پیش کرتا ہے۔ ایک طرف تو اسے وہ ہر مسلمان کا انفرادی فریضہ سمجھتا ہے تو دوسری طرف امتِ مسلمہ کو اجتماعی طور پر تبلیغ کی ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ چنانچہ تبلیغ کے لیے تنظیم کا نظریہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى ٱلْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ٱلْمُنكَرِ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ([31])

تم میں ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے جو خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کام کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے۔

انفرادی، اجتماعی اور تنظیمی طور پر مسلمانوں کو تبلیغ کا نظریہ دینے کے علاوہ اسلام نے انہیں اس کا طریق کار بھی سمجھا دیا ہے۔ بالخصوص اس سلسلے میں جبر و اکراہ اور طاقت کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ ٱلْحَسَنَةِ ۖ وَجَٰدِلْهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ ([32])

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف دانائی کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلائیں اور اگر بحث آن پڑے تو ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

مندرجہ بالا عوامل اسلامی ثقافت کے اساسی اجزائے ترکیبی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ان ہی اجزائے ترکیبی سے ایک صالح معاشرے کی تشکیل کی جو ایک مثالی نمونے کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے لیے ایک مشعلِ راہ کا کام دیتا رہے گا۔

# حوالے وحواشی

[1]۔ النساء،۴: ۱

[2]۔ الحجرات،۴۹: ۱۳

[3]۔ التین،۹۵: ۴

[4]۔ الإسراء،۱۷: ۷۰

[5]۔ لقمان،۳۱: ۲۰

[6]۔ الحجرات،۴۹: ۱۰

[7]۔ آلِ عمران،۳: ۱۰۳

[8]۔ النحل،۱۶: ۹۰

[9]۔ الانعام،۶: ۱۵۲

[10]۔ النساء،۴: ۱۳۵

[11]۔ المائدہ،۵: ۸

[12]۔ البقرہ،۲: ۲۵۶

[13]۔ یونس،۱۰: ۹۹

[14]۔ الشوریٰ،۴۲: ۴۸

[15]۔ الزمر،۳۹: ۹

[16]۔ المجادلہ،۵۸: ۱۱

[17]۔ طٰہٰ،۲۰: ۱۱۴

[18]۔ ابوداؤد، ترمذی؛ ابن ماجہ، السنن، المقدمۃ، باب فضل العلماء، تحقیق، محمد فؤاد عبد الباقی، ۱/ ۸۱

[19]۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی

[20]۔ الملک،۶۷،۲

[21]۔ فاطر:۳۵: ۱۸

[22]۔ النجم،۵۳: ۳۹

[23]۔ الروم،۳۰: ۲۱

[24]۔ النساء،۴: ۳۴

[25]۔ النساء،۴: ۱

[26]۔ البقرہ،۲۲۸:۲

[27]۔ مشکوۃ المصابیح

[28]۔ النور،۲۴: ۵۵

[29]۔ الشوریٰ،۴۲: ۳۸

[30]۔ اٰلِ عمران،۳: ۱۵۹

[31]۔ اٰلِ عمران،۳: ۱۰۴

[32]۔ النحل،۱۶: ۱۲۵

★★★★★

*ڈاکٹر حافظ عثمان احمد

# حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ ﷺ کے مقامِ تدفین ہونے پر شبہات کا ناقدانہ جائزہ

اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین جس گھر میں ہوئی اور آج جہاں آپ کی قبر مبارک موجود ہے، وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا گھر تھا۔

ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں:

**وَلَا خِلَافَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وسلم دُفِنَ فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ مِنْ بَيْتِهِ بَيْتِ عَائِشَةَ (رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا)**[1]

علما کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر یعنی بیت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اسی جگہ پر دفن کیے گئے جہاں آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔

* اسسٹنٹ پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

**قَدْ عُلِمَ بِالتَّوَاتُرِ أَنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ دُفِنَ فِي حُجْرَةِ عَائِشَةَ الَّتِي كَانَتْ تَخْتَصُّ بِهَا** [2]

یہ تواتر سے جانا گیا ہے کہ نبی ﷺ حجرۂ عائشہ میں جو ان کے لیے مخصوص تھا، دفن کیے گئے۔

بعض افرد اور گروہوں نے امت مسلمہ کے اس متواتر اور اجماعی مسئلے کا انکار کیا اور یہ رائے اختیار کی جہاں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں وہ حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنھا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے درج ذیل شبہات کا اظہار کیا ہے۔

**شبہ اول**

**أن بيت عائشة كان صغيراً جدًّا، وكذا كانت كل بيوت زوجات رسول الله صلى الله عليه وآله، ويدل على ذلك قول عائشة: كنتُ أنام بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجلاي في قبلته، فإذا سجد غمزني فقبضت رجلي، فإذا قام بسطتها، قالت: والبيوت يومئذ ليس فيها مصابيح. (صحيح البخاري ١٤٢/١، ١٧٣)، فلو كان النبي صلى الله عليه وآله قد دُفن في حجرة عائشة، ثم دُفن فيها بعد ذلك أبو بكر ثم عمر لما كان لعائشة أي مكان تمكث فيه، ولكانت تتجوَّل على القبور، وتنام وتصلي على القبور، وهذا لم يقل به أحد.**

حضرت عائشہؓ کا گھر بہت ہی چھوٹا تھا۔ اسی طرح تمام ازواجِ رسول اللہ ﷺ کے گھر تھے۔ اس پر حضرت عائشہؓ کا قول دلالت کرتا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوئی ہوتی تھی اور میرے دونوں پاؤں آپ کے قبلے کی جانب ہوتے تھے۔ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تھے تو مجھے اشارہ کرتے تو میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی جب آپ قیام کی طرف چلے جاتے تو میں پھیلا لیتی۔ انہوں نے کہا: گھروں میں ان دنوں چراغ نہیں ہوتا تھا۔ (صحیح بخاری) اگر نبی ﷺ حجرۂ عائشہؓ

میں دفن کیے گئے پھر ابو بکرؓ اور پھر عمرؓ دفن کیے گئے تو حضرت عائشہؓ کہاں رہتی تھیں۔ وہ تو قبروں پر ہی گھومتی رہتی ہوں گی اور قبروں پر ہی سوتی اور نماز پڑھتی ہوں گی۔ لیکن یہ کسی نے کہا نہیں۔

**تجزیہ**

ا۔ حجرات کا حجم و رقبہ جس میں حضرت عائشہ کا حجرہ بھی شامل ہے، امام بخاری نے الادب المفرد میں اس طرح نقل کیا ہے۔

**عن دَاوُدُ بْنُ قَيْسٍ قَالَ: رَأيتُ الحُجراتِ مِن جَريدِ النَّخلِ مُغشَّاة مِن خَارجٍ بمسُوحِ الشَّعروَأظُنُ عَرْضَ البَيتِ مِن بَاب الحُجرةِ إلَى بَاب البيتِ نَحْوًا مِن سِتٍ أَو سبعِ أَذرعٍ، وأحْزِرُ البيتِ الدَّاخِلَ عَشرَ أَذرعٍ، وأَظنُ سُمكَهُ بَين الثَّمانِ والسَّبْعِ نَحو ذَلك، ووقَفتُ عِند بَاب عَائشةَ فَإذا هُو مُستَقبِلَ المَغربَ**[3]

داؤد بن قیس نے کہا کہ میں نے حجرات کو دیکھا کہ کھجور کی بغیر پتوں والی شاخوں سے بنے جو باہر سے اون کے کپڑے سے ڈھکے تھے (یعنی پردے اون کے کپڑے کے تھے)۔ میرا خیال ہے کہ حجرے کے بیرونی دروازے سے اندرونی گھر کے دروازے تک کا فاصلہ چھ سے سات ذراع تھا جب کہ اندرونی حصے کا رقبہ دس ذراع تھا اور میرا خیال ہے کہ چھت کی اونچائی آٹھ یا سات ذراع تھی۔ میں باب عائشہ کے پاس کھڑا تھا تو اس کا رخ مغرب کی جانب تھا۔

ایک ذراع مساحت (زمین کی پیمائش ناپنے کا پیمانہ) ساڑھے تین فٹ ہے جب کہ ذراع کرباس (پانی کی پیمائش کا پیمانہ) ڈیڑھ فٹ ہے۔[4] اگر حجرے کے بیرونی دروازے سے اندرونی احاطے کا فاصلہ اس روایت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ سولہ یا سترہ ذراع بنتا ہے۔ گویا ذراع مساحت کے اعتبار سے تقریباً چھپن یا انسٹھ فٹ اور ذراع کرباس کے مطابق چوبیس یا پچیس فٹ کا فاصلہ بیرون سے اندرون تک تھا۔[5]

اس سے معلوم ہوا کہ حجرۂ عائشہ ضرورت کے مطابق وسیع تھا۔ اور قبور کے بعد بھی کافی جگہ باقی تھی جو رہائش کے لیے کافی تھی۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا نے حجرہ میں ایک دیوار بنوا کر اس کو دو حصوں میں تقسیم کروا دیا تھا۔ جنوبی طرف قبلہ میں تین قبور اور شمالی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کی رہائش گاہ بن گئی۔

**سَمِعْتُ مَالِكَ بْنَ أَنَسٍ يَقُولُ: قُسِمَ بَيْتُ عَائِشَةَ بِاثْنَيْنِ:قِسْمٌ كَانَ فِيهِ الْقَبْرُ. وَقِسْمٌ كَانَ تَكُونُ فِيهِ عَائِشَةُ. وَبَيْنَهُمَا حَائِطٌ**[6]

مالک بن انس کو کہتے سنا کہ حضرت عائشہؓ کا گھر دو حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ ایک حصہ جس میں قبر تھی اور ایک حصہ جس میں وہ رہتی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان دیوار تھی۔

معلوم ہوا کہ قبور اور رہائش گاہ میں نبی ﷺ کی تدفین کے بعد ہی علیحدگی اور فصل تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بعد دیوار بھی بنادی گئی تھی۔

۳۔ قبور کتنی جگہ گھیرے ہوئی ہیں۔ اس کے بارے میں درج ذیل روایت سے اندازہ قائم کیا گیا ہے۔

**عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى عَائِشَةَ فَقُلْتُ: يَا أُمَّةَ اكْشِفِي لِي عَنْ قَبْرِ النَّبِيِّ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَصَاحِبَيْهِ. فَكَشَفَتْ لِي عَنْ ثَلاثَةِ قُبُورٍ لا مُشْرِفَةٍ وَلا لاطِئَةٍ مَبْطُوحَةٍ بِبَطْحَاءِ الْعَرْصَةِ الْحَمْرَاءِ. زاد الحاكم: فرأيت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم مقدما، وأبا بكر رأسه بين كتفي النبي صلّى الله عليه وسلّم، وعمر رأسه عند رجلي النبي صلّى الله عليه وسلّم** [7]

قاسم بن محمد بن ابی بکر کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے پاس گیا اور میں نے عرض کی اے اماں جان! میرے لیے نبی ﷺ اور ان کے دونوں ساتھیوں کی قبریں کھول دیجیے۔ آپ رضی اللہ عنھا نے میرے لیے تینوں قبور کھول دیں جو نہ تو زمین سے بلند تھیں اور نہ

زمین سے ملی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر میدان کی سرخ کنکریاں ڈالی ہوئی تھیں۔ حاکم نے اضافہ کیا ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پہلے ہیں اور ابو بکرؓ کا سر نبی ﷺ کے کندھوں کے مابین ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سر نبی ﷺ کے قدموں میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے قد مبارک اور حضرت عمر رضی اللہ کی طوالت کو مد نظر رکھا جائے تو قبور کی مساحت شرقاً غرباً پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ جب کہ حجرہ مبارکہ کی جنوب کی طرف قبلہ کی دیوار کی لمبائی بائیس فٹ چھ انچ ہے۔[8]

اس سے معلوم ہوا کہ رہائش گاہ کے لیے قبور کے بعد بہت زیادہ جگہ باقی تھی۔

۴۔ باقی روایات میں منقول اس بات کہ رسول اللہ ﷺ سجدہ فرماتے تو حضرت عائشہ پاؤں سمیٹ لیتیں اور جب آپ ﷺ قیام میں چلے جاتے تو پاؤں دراز کر لیتیں، یہ استدلال کرنا کہ جگہ اتنی ناکافی تھی کہ دو آدمیوں کے امور کی انجام دہی میں سہولت ہو، درست نہیں۔ کیونکہ روایت سے واضح ہے کہ یہ استراحت کے مقام کے پاس رسول اللہ ﷺ نماز ادا کرتے تھے۔ گویا جس مقام پر نماز ادا کرتے تھے وہ نماز ادا کرنے کے لیے تنگ تھی نہ کہ پورا حجرہ ہی چھوٹا اور تنگ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے افعال کا مقصود شریعت کے احکام کا ابلاغ ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا اس مقام پر نماز ادا کرنا تعلیمِ دین کے لیے تھا۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ نے اسی سے استدلال فرمایا:

**عن مسروقٍ قالَ: قيلَ عندَ عائشةَ: يَقطعُ الصلاةَ الحمارُ والكلبُ والمرأةُ. قالتْ: عَدَلتُمونا بالكلابِ والحميرِ، لَقد رأيتُني أَكونُ مع رسولِ اللهِ على السريرِ، فيقومُ مِن الليلِ فيُصلِّي وأَنا بينَه وبينَ القبلةِ**[9]

مسروقؒ سے منقول ہے کہ حضرت عائشہؓ کے سامنے کہا گیا کہ گدھے، کتے اور عورت کے سامنے آنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ فرمایا: تم نے عورت کو کتے اور گدھے کے برابر کر دیا۔ میں

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چارپائی پر ہوتی تھی۔ پھر آپ ﷺ رات کو نماز کے لیے اٹھتے اور میں ان کے سامنے قبلہ طرف لیٹی ہوتی تھی۔

اس روایت سے بہت سے مسائل فقہیہ پر استدلال کیا گیا ہے۔

**شبہ دوم**

**روي عن عائشة أنها قالت: كنت أدخل بيتي الذي فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم وإني واضع ثوبي، وأقول: إنما هو زوجي وأبي، فلما دفن عمر معهم فوالله ما دخلت إلا وأنا مشدودة عليَّ ثيابي حياءً من عمر رضي الله عنه. (مسند أحمد بن حنبل ٢٠٢/٦ ،المستدرك ٦٣/٣، قال الحاكم: «هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، ولم يخرجاه». وقال الهيثمي في مجمع الزوائد ٢٦/٨: رواه أحمد، ورجاله رجال الصحيح)**

**ومن غير المعقول أن عائشة بقيت كل وقتها في غرفتها مشدودة عليها ثيابها متحجبة من عمر حتى توفيت.**

عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: میں اپنے گھر کے اس حصے میں میں داخل ہوتی تھی جہاں رسول اللہ ﷺ کی قبر تھی اور میں کپڑوں کو سنبھالے ہوئے نہ ہوتی تھی اور میں کہتی کہ یہ میرے شوہر اور یہ میرے والد ہیں لیکن جب ان کے ساتھ عمرؓ دفن کر دیے گئے تو اللہ کی قسم حضرت عمرؓ سے حیا کے باعث میں کبھی نہیں داخل ہوئی مگر اس حال میں کہ میں نے اپنے کپڑوں میں لپٹی ہوتی تھی۔ (مسند احمد بن حنبل، المستدرک، حاکم نے کہا: یہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے لیکن انہوں نے اس کی تخریج نہیں؛ الھیثمی نے **مجمع الزوائد** میں کہا کہ اس کو روایت کیا احمد نے اور اس کے رواۃ صحیح روایت کے رواۃ ہیں)

یہ غیر عقلی بات ہے کہ حضرت عائشہ ہر وقت کمرے میں کپڑوں میں لپٹی، حضرت عمرؓ سے حالتِ حجاب میں رہتی تھیں اور تاوفات یہی حالت رہی۔

## تجزیہ

۱۔ اس روایت کے اندر الفاظ **فواللہ ما دخلت** وضاحت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ قبور والے حصے میں نہیں رہتی تھیں۔ "اللہ کی قسم میں داخل نہیں ہوئی" سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ علیحدہ حصہ تھا جہاں وہ رہتی نہیں تھیں بلکہ بالخصوص جانا ہوتا تو جاتی تھیں۔ **دخلت** کے الفاظ کسی غرفے یا احاطے میں جو علیحدہ کر دیا گیا ہو، میں داخل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ لایعنی بات ہے کہ حضرت عائشہؓ کو تاوفات، ہر وقت حالتِ حجاب میں کپڑوں میں لپٹا رہنا پڑا ہو گا۔

۲۔ ابن شبۃ (المتوفیٰ: ۲۶۲ھ) اپنی کتاب **تاریخ المدینة** میں لکھتے ہیں:

**عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْأَنْصَارِيَّةِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: «مَا زِلْتُ أَضَعُ خِمَارِي وَأَتَفَضَّلُ فِي ثِيَابِي فِي بَيْتِي حَتَّى دُفِنَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِيهِ، فَلَمْ أَزَلْ مُتَحَفِّظَةً فِي ثِيَابِي حَتَّى بَنَيْتُ بَيْنِي وَبَيْنَ الْقُبُورِ جِدَارًا فَتَفَضَّلْتُ بَعْدُ»**[10]

عمرہ بنت عبد الرحمان الانصاریۃ سے روایت ہے کہ عائشہؓ نے فرمایا: میں اپنی اوڑھنی ہٹائے ہوئے رہتی تھی اور میں اپنے گھر میں ایک ایک کپڑے میں ہی رہتی تھی یہاں تک کہ حضرت عمر بن الخطاب دفن کیے گئے تو میں اس کے بعد کبھی اپنے لباس سے بے گانہ نہیں ہوئی (یعنی اپنے ستر و حجاب کی حفاظت کرتی تھی) یہاں تک کہ میں نے قبور اور اپنے درمیان دیوار بنالی۔ اس کے بعد پھر میں ایک کپڑے میں رہ لیتی تھی۔

### شبہ سوم

**أنه روي أن عائشة أوصت بحجرتها إلى عبد الله بن الزبير، فقد أخرج البيهقي في سننه بسنده عن هشام بن عروة: كان عبد الله بن الزبير يعتد بمكة ما لا يعتد بها أحد من الناس، أوصت له عائشة رضي الله عنها بحجرتها، واشترى حجرة سودة (سنن البيهقي ۳۴/۶ ،الطبقات الكبرى لابن سعد ۱۱۸/۸)**

قلت: إذا كانت عائشة قد فعلت ذلك فمن المعلوم أن ابن الزبير لم يشتر الحجرة التي فيها قبر رسول الله صلى الله عليه وآله، ولم يكن المتصرّف فيه بعد عائشة، وهذا يدل على أن النبي صلى الله عليه وآله لم يدفن في حجرة عائشة، وإنما دفن في موضع آخر.

بل روى ابن سعد في الطبقات عن ابن أبي سبرة، قال: فأخبرني بعض أهل الشام أن معاوية أرسل إلى عائشة... واشترى من عائشة منزلها يقولون بمائة وثمانين ألف درهم، ويقال: بمائتي ألف درهم، وشرط لها سكناها حياتها، وحمل إلى عائشة المال، فما رامت من مجلسها حتى قسمته. ويقال: اشتراه ابن الزبير من عائشة، بعث إليها يقال: خمسة أجمال بخت تحمل المال، فشرط لها سكناها حياتها، فما برحت حتى قسمت ذلك، فقيل لها: لو خبأت لنا منه درهماً. فقالت عائشة: لو ذكرتموني لفعلت. (الطبقات الكبرى ١۶۴/٨)

ولا يمكن أن نتصور أن تبيع عائشة الحجرة التي دفن فيها رسول الله صلى الله عليه وآله وأبو بكر وعمر إلى معاوية، فإن ذلك ليس حقا لها ليصح لها بيعه!!

مروی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبد اللہ بن الزبیر کے لیے اپنے حجرے کی وصیت کی تھی۔ بیہقی اپنی سنن میں اپنی سند کے ساتھ روایت کی تخریج کی ہے کہ ھشام بن عروہ نے کہا: عبد اللہ بن الزبیر مکہ میں اس قدر التزاماً رہتے تھے کہ لوگوں میں سے کوئی بھی ایسے نہیں رہتا ہو گا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کے لیے اپنے حجرے کی وصیت کر دی۔ انہوں نے حضرت سودۃ کا حجرہ خرید لیا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت عائشہ نےؓ یہ کیا تو معلوم بات ہے کہ ابن الزبیر نے اس حجرے کو نہیں خریدا جس میں قبرِ رسول تھی۔ حضرت عائشہؓ کے بعد وہ اس میں متصرف بھی نہیں تھے۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ نبی ﷺ حجرۂ عائشہ میں دفن نہیں ہوئے بلکہ کسی اور مقام پر دفن ہوئے۔

بلکہ ابن سعد نے **الطبقات** میں ابن سبرۃ سے یہ روایت کیا: انہوں نے کہا مجھے بعض اہلِ شام نے خبر دی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہؓ کو پیغام بھیجا۔۔۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے ایک لاکھ اسی ہزار درہم میں ان کا گھر خرید لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے دو لاکھ درہم میں خریدا تھا۔ اس شرط کے ساتھ کہ پوری زندگی اس میں رہائش پذیر رہیں گی۔ حضرت عائشہؓ تک یہ مال پہنچایا تو وہ اس مجلس سے گئی ہی نہیں جب تک اس کو تقسیم نہ کر لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو ابن الزبیر نے خرید لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پانچ طاقتور اونٹنیوں کے بقدر مال لاد کر بھیج دیا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں جب تک تقسیم نہیں کر دیا۔ کہا گیا: اگر کچھ درہم ہمارے لیے پس پشت کر لیتیں؟ تو عائشہؓ نے کہا مجھے پہلے یاد کروا دیتے تو میں یہ کر لیتی۔ (**الطبقات الکبریٰ**)

یہ ممکن نہیں کہ ہم یہ تصور کریں کہ حضرت عائشہ نے وہ حجرہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ بیچ دیا جس میں رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما دفن تھے۔ یہ ان کا حق نہیں، نہ ہی یہ بیع درست تھی۔

**تجزیہ**

**ا۔** حضرت عائشہؓ نے اپنی رہائش و قیام گاہ فروخت کی نہ کہ قبورِ ثلاثہ کی جگہ۔ جب روایت میں **منزلہا** کے الفاظ ہیں تو اس مراد رہائش گاہ ہے نہ کہ قبور کیونکہ قبور کا حصہ گھر سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

**۲۔** بالفرض محال اگر قبور کی جگہ بھی فروخت کی گئی ہو تو بھی اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں کیونکہ ملکیتی جگہ کو فروخت کر دینا چاہے اس میں قبور ہوں یا منازل کوئی ناجائز یا ناپسندیدہ امر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی جو جگہ خرید فرمائی تھی یہ بھی قبور کا مقام تھا۔[11]

**۳۔** اگر حضرت عائشہؓ اس کو فروخت نہ کرتیں اور آپ اسی حال میں دنیا سے رخصت ہوتیں کہ یہ آپؓ کی تملیک میں ہوتا تو اس پر کوئی تصرف ممکن نہ ہوتا اور اس کی بقا بعینہ رکھنا شرعی امر بن جاتا۔

(راقم کے نزدیک عبد اللہ بن الزبیرؓ کے خریدنے کی روایت مرجوح ہے اور حضرت معاویہؓ کے خریدنے کی روایت راجح ہے۔ اس کی داخلی دلیل یہ ہے کہ عبد اللہ بن الزبیرؓ کا پانچ طاقتور اونٹنیوں پر لاد کر مال بھیجنا تب ممکن ہے کہ جب وہ حاکم ہوں اور ان کے پاس مالِ خمس آرہا ہو یا ان کے پاس بہت مال ہو۔ خلیفہ وہ حضرت عائشہؓ کی وفات کے بعد بنے اور ان کا کثیر المال ہونا منقول نہیں۔ پھر ایک طرف ان کے لیے حضرت عائشہ کا وصیت کرنا مروی ہے اور دوسری طرف بیع کرنا منقول ہے۔ یہ تناقض ہے)

**شبہ چہارم**

**روى الدارمي في سننه ٤٧/١ بسنده عن أوس بن عبد الله، قال: قحط أهل المدينة قحطاً شديداً، فشكوا إلى عائشة، فقالت: انظروا قبر النبي صلى الله عليه وسلم، فاجعلوا منه كوىً إلى السماء، حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف، قال: ففعلوا، فمُطرنا مطراً حتى نبت العشب، وسمنت الإبل حتى تفتَّقت من الشحم، فسُمّي عام الفتق. (صحَّح هذا الحديث الشيخ عبد الله الصديق الغماري، وقال: ضعَّف الألباني هذا الأثر بسعيد بن زيد، وهو مردود؛ لأن سعيداً من رجال مسلم، ووثقه يحيى بن معين. وضعفه أيضاً باختلاط أبي النعمان، وهو تضعيف غير صحيح؛ لأن اختلاط أبي النعمان لم يؤثر في روايته، قال الدارقطني: تغيَّر بأخرة، وما ظهر له بعد اختلاط حديث منكر، وهو ثقة. وقول ابن حبان: وقع في حديثه المناكير الكثيرة بعد اختلاطه، ردَّه الذهبي، فقال: لم يقدر ابن حبان أن يسوق له حديثاً منكراً، والقول فيه ما قال الدارقطني، وابن تيمية كذَّب أثر عائشة، ولا عبرة به؛ لجرأته على تكذيب ما يخالف هواه، والحمد لله رب العالمين. (إرغام المبتدع الغبي بجواز التوسل بالنبي)).**

**وكلامها ظاهر في أنه مكان آخر غير الغرفة التي كانت تسكن فيها عائشة، إذ من غير المتوقع أن تشير عائشة عليهم بهدم سقف الحجرة التي كانت تسكن فيها، فلا تحميها من مطر ولا حر ولا برد.**

دارمی نے اپنی سند کے ساتھ اپنی سنن میں اوس بن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: اہلِ مدینہ شدید قحط میں مبتلا ہوئے۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا: قبر نبی ﷺ کی زیارت کرو، اس میں ایک کھڑکی آسمان کی طرف بنادو تاکہ آسمان اور قبر نبی ﷺ کے مابین کوئی چھت کی آڑ باقی نہ رہے۔ انہوں نے بتایا کہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ ہم پر اس قدر بارش برسی کہ سرسبز گھاس اگ آئی، اونٹ موٹے ہوگئے یہاں تک کہ چربی سے پھٹ پڑے۔ اس سال کو **عام الفتق** کا نام دیا گیا۔ الشیخ عبد اللہ الصدیق الغماری نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔ کہا: الالبانی نے سعید بن زید کے باعث اس اثر کی تضعیف کی ہے۔ یہ تضعیف مردود ہے کیونکہ سعید بن زید مسلم کے رجال میں سے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی ہے۔ ابو النعمان کے اختلاط کے باعث بھی اس کی تضعیف کی ہے۔ یہ تضعیف بھی درست نہیں۔ کیونکہ ابو النعمان کا اختلاط اس کی روایت میں مؤثر نہیں۔ الدار قطنی نے کہا کہ آخرِ عمر میں اختلاط ہوا۔ اختلاط کے بعد جو روایت کی ہے وہ منکر ہے اور وہ ثقہ ہے۔ ابن حبان کا قول ہے: اختلاط کے بعد اس کی روایات میں کثرت سے مناکیر ہیں۔ الذھبی نے تردید کرتے ہوئے کہا ہے: ابن حبان کا اختیار نہیں کہ اس کی طرف منکر حدیث کو منسوب کریں۔ جو الدارقطنی نے کہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ ابن تیمیہؒ نے اس اثر کو کذب قرار دیا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں بسبب ان کی جسارت کے کہ جو ان کی مرضی کے خلاف ہو اس کو کذب قرار دے دیتے ہیں۔ (**إرغام المبتدع الغبي بجواز التوسل بالنبي**)

حضرت عائشہؓ کے کلام سے واضح ہے کہ وہ کوئی ان کے رہائشی کمرے کے علاوہ کوئی مقام تھا۔ کیونکہ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے حجرے کی چھت کو منہدم کرنے کا مشورہ دیں جس میں رہائش پذیر ہوں جس کا نتیجہ ہو کہ وہ بارش سے محفوظ نہ رہ سکیں اور نہ ہی سردی گرمی سے بچ سکیں۔

**تجزیہ:**

۱۔ کیا کسی کمرے میں عارضی کھڑکی یا روشن دان بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اب کبھی اسے بند نہیں کیا جا سکتا اور اس سے بارش یا دھوپ کی تکلیف ہمیشہ برداشت کرنا پڑے گی؟ یہ کس عقلی اصول سے لازم آیا؟ کیا گھروں میں ضرورتوں کے تحت چھتوں میں شگاف نہیں ڈالے جاتے جو کہ ضرورت پوری ہونے پر بند کر دیے جاتے ہیں؟

۲۔ اگر چھت میں وہ شگاف ڈالا گیا تو روایت کے مطابق واضح ہے کہ قبر نبوی اور آسمان کے مابین آڑ دور کرنے کے لیے ڈالا گیا۔ قبر کے بالکل اوپر شگاف سے حضرت عائشہؓ کے لیے رہائش کی تکلیف کا کیا معنی؟ بارش یا دھوپ قبرِ نبی ﷺ پر پڑنی تھی نہ کہ حضرت عائشہؓ پر۔

۳۔ اگر قبرِ نبی ﷺ کے مقام کا حضرت عائشہؓ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا تو ان سے مشاورت کا کیا معنی رہ جاتا ہے اور ان کے کہنے پر چھت میں شگاف ڈال دینے کا کیا جواز ہو گا؟ کسی دوسرے کے گھر میں حضرت عائشہؓ کے کہنے پر شگاف ڈال دینا کیسے لوگوں نے تسلیم کر لیا؟

۴۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ قبورِ ثلاثہ کا مقام، حضرت عائشہؓ کے حجرے کا رہائشی حصہ نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر روایات سے ثابت کیا جا چکا ہے۔

**شبہ پنجم**

أن الحوادث الكثيرة دلت على أن الناس كانوا في حياة عائشة يأتون إلى قبر النبي صلى الله عليه وآله، وربما جلسوا عنده، فهل كان بيت عائشة مفتوحاً لكل من يريد الدخول لزيارة قبر رسول الله صلى الله عليه وآله؟

وهذه الحوادث كلها تدل على أن النبي صلى الله عليه وآله دفن في مكان واسع آخر غير غرف نسائه، وهو المكان الذي كان يلتقي فيه بالناس، وهو مكان قريب من غرف نسائه.

(ما رواه الإمام أحمد بن حنبل بسنده عن عائشة قالت: ما علمنا بدفن رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى سمعت صوت المساحي من آخر الليل ليلة

الأربعاء. (مسند أحمد بن حنبل (٦٢/٦)

وأخرج عبد الرزاق في مصنفه بسنده عن عائشة قالت: ما شعرنا بدفن النبي صلى الله عليه وسلم حتى سمعنا صوت المساحي من آخر الليل. (المصنف ٣٣٩/٣).

وهذا يدل على أن النبي صلى الله عليه وآله دفن في بيت آخر غير بيت عائشة، وإلا لو دفن النبي صلى الله عليه وآله في بيت عائشة لعلمت بذلك حتماً.

والنتيجة أن الذي يظهر من مجموع ذلك أن النبي صلى الله عليه وآله لم يدفن في بيت عائشة، وإنما دفن صلى الله عليه وآله كما قلنا في حجرة خاصة كان يستقبل النبي صلى الله عليه وآله فيها الناس، ولم تكن تلك الحجرة حجرة عائشة ولا غيرها من زوجات رسول الله صلى الله عليه وآله، إلا أن عائشة صارت تدَّعي أن النبي صلى الله عليه وآله دُفن في حجرتها، فصدَّقها الناس، مع أن الأمر لم يكن كذلك

ولا يخفى أنه ليس الغرض من هذا البحث هو التقليل من عائشة أو سلبها فضيلة ثبتت لها؛ لأن ثبوت أن النبي صلى الله عليه وآله لم يدفن في بيت عائشة لا يستلزم القدح في عائشة كما لم يستلزم القول بأن النبي صلى الله عليه وآله دُفن في بيت عائشة أي قدح في زوجات رسول الله صلى الله عليه وآله الأخريات

وبالمقابل فإن ثبوت أن قبر النبي صلى الله عليه وآله في بيت عائشة لا يدل على أي فضيلة لعائشة: لأنه بالنتيجة بيت من بيوت النبي صلى الله عليه وآله كما قلنا، وهو كسائر بيوته الأخرى.

کثیر حوادث کا وقوع دلالت کرتا ہے کہ لوگ حضرت عائشہؓ کی حیات میں قبر نبی ﷺ پر آیا کرتے تھے۔اور ممکنہ طور پر وہاں بیٹھا کرتے تھے کیا عائشہؓ کا گھر ہر اس شخص کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا جو بھی قبرِ رسول ﷺ کی زیارت کرنے کا خواہش مند ہوتا تھا؟

یہ سب حوادث دلالت کرتے ہیں کہ کہ نبی ﷺ ازواج کے حجروں کے علاوہ کسی وسیع مقام پر دفن کیے گئے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں لوگ بالعموم آتے جاتے تھے۔ یہ ازواج کے گھروں کے قریب تھا۔ (امام احمد بن حنبل نے اپنی سند سے جو روایت کیا ہے کہ عائشہؓ نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ ﷺ کے دفن کیے جانے کا پتا نہیں چلا مگر جب ہم نے رات کے آخری پہر بدھ کی رات مٹی ڈالنے کی آواز سنی (مسند احمد بن حنبل)

عبد الرزاق نے اپنی **مصنف** میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے دفن کیے جانے کا احساس نہیں ہوا یہاں تک کہ ہم نے رات کے آخری پہر بدھ کی رات مٹی ڈالنے کی آواز سنی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کسی اور کے گھر میں دفن کیے گئے کیونکہ اگر حضرت عائشہ کے گھر میں دفن کیے گئے ہوتے تو ان کو یقیناً اور حتمی طور پر تدفین کا پتا چلتا۔

مجموعی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی ﷺ بیتِ عائشہ میں دفن نہیں کیے گئے۔ نبی ﷺ کی تدفین کسی اور خاص حجرے میں کی گئی جہاں نبی ﷺ لوگوں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ یہ حجرہ عائشہؓ اور دیگر ازواج میں سے کسی کا بھی نہیں تھا مگر بعد میں حضرت عائشہؓ نے دعویٰ کر دیا کہ میرے حجرے میں دفن کیے گئے ہیں اور لوگوں نے اس کی تصدیق کی حالانکہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔

اس بحث کا مقصد حضرت عائشہ کو کم دکھانا یا ان کی ثابت شدہ فضیلت ان سے سلب کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کرنے سے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں دفن نہیں ہوئے ان کی شان میں نقص لازم نہیں آتا جیسا کہ یہ ثابت کرنے سے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں دفن ہوئے اس سے دیگر ازواج کی شان میں نقص لازم نہیں آتا ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ کے گھر میں نبی ﷺ کی قبر ثابت کرنے سے حضرت عائشہؓ کی کسی فضیلت پر دلالت نہیں ہوتی۔

کیونکہ بہر حال نتیجتاً وہ نبی ﷺ کے دیگر گھروں کی طرح ایک گھر ہے۔

یہ عبارت در حقیقت متعدد شکوک واوہام کا مجموعہ ہے۔

**اول: زیارتِ قبر نبوی کے لیے لوگوں کی کثرت سے آمد ورفت ہوتی ہوگی تو کیا یہ گھر ہمیشہ کھلا رہتا تھا جس میں سیدہ عائشہ رہتی تھیں۔ وہ کیسی رہائش گاہ ہوگی جو ہمہ وقت کھلی رہتی ہو؟**

ا۔ رسول اللہ ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما کی قبر کی زیارت کے لیے جو لوگ بھی آتے سیدہ عائشہؓ کی اجازت سے ہی آتے تھے نہ کہ ہر وقت دروازہ کھلا رہتا تھا۔ جیسا آپ کے بھتیجے قاسم بن محمد بن ابی بکر کی روایت میں ہے۔

**عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى عَائِشَةَ فَقُلْتُ: يَا أُمَّةَ اكْشِفِي لِي عَنْ قَبْرِ النَّبِيِّ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَصَاحِبَيْهِ. فَكَشَفَتْ لِي**[12]

قاسم بن محمد بن ابی بکر کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا اور میں نے عرض کی اے اماں جان! میرے لیے نبی ﷺ اور ان کے دونوں ساتھیوں کی قبریں کھول دیجیے۔ آپ رضی اللہ عنہا نے میرے لیے تینوں قبور کھول دیں

۲۔ محققین کے نزدیک حجرۂ عائشہؓ کے بیرونی دروازے تین تھے۔ (اندرونی دروازے اس کے علاوہ تھے)

**ایک دروازہ:** نبی ﷺ نے جس دروازے کو اپنے لیے مختص کیا تھا۔ اسی سے رسول اللہ ﷺ اپنا سر مبارک دورانِ اعتکاف گھر میں اندر کر دیتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ کنگھی کر دیا کرتی تھیں۔[13] یہی وہ دروازہ جہاں سے حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر حبشیوں کا کھیل دیکھا تھا۔[14]

**دوسرا دروازہ:** آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو جس دروازے سے صحابہ کرام حجرے میں داخل ہو کر صلاۃ وسلام پڑھتے تھے۔ امام شافعیؒ نے اس دروازے کے بارے میں کہا کہ دروازے کی دائیں جانب ہے۔ یہ دروازہ مغربی طرف تھا۔[15]

**تیسرا دروازہ:** وہ دروازہ جس سے صحابہ وفاتِ نبی ﷺ کے وقت صلاۃ وسلام پڑھ کے نکل جاتے تھے۔

**فَكَانُوا يَدْخُلُونَ مِنْ هَذَا الْبَابِ فَيُصَلُّونَ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَخْرُجُونَ مِنَ الْبَابِ الْآخَرِ**[16]

وہ اس دروازے سے داخل ہوتے تھے، درود پڑھتے تھے پھر دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔

یہ دروازہ ملکِ شام کی سمت میں تھا۔[17]

لہٰذا ایک ہی دروازہ نہیں تھا کہ داخلے کے لیے ہر وقت سیدہ عائشہؓ کے لیے دقت ہو۔ اس لیے ضرور ایک دروازہ مختص کر دیا ہو گا جس سے زائرین داخل ہو کر زیارت کر کے چلے جاتے ہوں گے۔

**۳:** آج بھی معروف صالحین وصوفیا کی قبور جہاں زائرین کی کثیر تعداد جاتی ہے، کی رسائی قبور تک نہیں ہوتی بلکہ محض قبور پر بنی عمارات کے دروازوں تک محدود ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور شیخین کی قبور تک رسائی کی بار بار سعی صحابہ و تابعین کے ہاں نہیں پائی جاتی تھی بلکہ وہ حجرۂ نبوی ﷺ تک محدود رہتے تھے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی تعمیر کے بعد غالباً قبورِ ثلاثہ کو مستقل بند کر دیا گیا اور آج تک کسی نے زیارت نہیں کی۔

**دوم: احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو تدفین کا پتا قبر کی مٹی ڈالنے کی آواز سن کر چلا۔ اگر ان کا حجرہ تھا اور وہیں تدفین ہو رہی تھی تو ان کا آنکھوں دیکھا حال ہونا چاہیے تھا؟**

**ا۔** یہ کیسے ممکن تھا کہ ازواج مطہرات سب کی سب اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھن بوقت تدفین مردوں کے درمیان کھڑی ہوتیں۔ یقیناً وہ سب اسی حجرے میں دوسرے غرفے میں

پردے میں موجود ہوں گی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ روایت منقول ہے کہ انہیں کھودنے کے آلات کی آواز سے تدفین کا پتا چلا۔[18]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی بوقتِ تدفین موجود نہیں تھیں۔ صحیح ابن حبان کی روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ أَنَسٌ: «فَلَمَّا دَفَنَّاهُ مَرَرْتُ بِمَنْزِلِ فَاطِمَةَ، فَقَالَتْ: يَا أَنَسُ أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التُّرَابَ؟[19]

انس فرماتے ہیں جب ہم نے آپ ﷺ کو دفنا دیا تو ہم فاطمہؓ کے گھر چلے گئے۔ انہوں نے کہا اے انس تمہارا دل کیسے مان گیا کہ تم نے رسول اللہ ﷺ پر مٹی ڈال دی؟

اس روایت میں تدفین کے بعد حضرت انس کا حضرت فاطمہ کے گھر جانا تصریحاً بیان ہوا۔ اگر فاطمہؓ دفن کے وقت موجود ہوتیں تو وہاں جانے کی ضرورت نہ تھی اور آپؓ کا یہ ارشاد بھی نہ ہوتا

۲۔ حدیث کے الفاظ صَوْتَ الْمَسَاحِي سے مراد مٹی ڈالنے کی آواز ہے یا جاتے ہوئے لوگوں کے قدموں کی آواز یا کھودنے کے آلات کی آواز، یہ لفظ دلالت کرتا کہ آپ بالکل قریب تھیں۔ کیونکہ دور سے یہ آواز آہی نہیں سکتی تھی۔ قریب ترین جگہ آپ کا اپنا حجرہ ہی ہو سکتا۔[20]

۳۔ رسول اللہ ﷺ کی تدفین وفات سے تین دن بعد ہوئی۔ اس لیے کسی کے لیے طبعاً ممکن نہیں تھا کہ مسلسل جسمِ مقدس کے پاس موجود رہتا۔ خواتین کے لیے وہاں موجود رہنا مزید ناممکن تھا جب کہ مرد کثرت سے آ رہے تھے۔

**سوم: حجرۂ عائشہ میں اگر تدفینِ رسول اللہ ﷺ ثابت ہو جائے تو یہ عائشہؓ کا فضل نہیں۔ کیونکہ اس دفن میں ان کا کوئی دخل و کردار نہیں۔ اگر بالفرض یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں دفن نہیں ہوئے تو اس سے ان کی عدمِ فضیلت نہیں ثابت نہیں ہوتی کیونکہ باقی ازواج کے گھر میں بھی تو تدفین نہیں ہوئی تو کیا اس سے ان کی عدم فضیلت ثابت ہوتی ہے؟**

۱۔ کوئی شک نہیں کہ سیدہ عائشہؓ کے فضائل و مناقب کی کثرت ہے اور ان کی شان صرف حجرۂ عائشہ میں رسول اللہ ﷺ کی تدفین تک محدود نہیں لیکن ایک ایک کر کے فضائل کا انکار کیا جائے اور یہ بھی کہتے جائیں فضیلت صرف اس میں ہی محدود نہیں۔ یہ طریقہ فضیلت تسلیم کرنے کی بجائے در اصل عناد نکالنے کا طریقہ ہے۔ اس طرح کا حکم تو ایک ایک کر کے ہر فضیلت کے بارے میں لگایا جا سکتا۔ جیسے کہا جائے کہ جبریل ﷺ کا رسول اللہ ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے نکاح سے قبل ان کی تصویر دکھانا ایسا نہیں کہ اگر ثابت نہ ہو تو سیدہ عائشہؓ کے لیے فضل میں کمی آئے گی۔ یقیناً نہیں کمی آئے گی مگر جو ثابت شدہ ہے اس کو کیوں مشکوک بنایا جائے؟

**۲۔** خاتم النبیین ﷺ کا مرقد ہونا اس مقام کے لیے بہت بڑا اشرف و فضل ہے۔ چونکہ یہ بیتِ عائشہؓ تھا اس لیے یہ شرف ان کا مقدر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تا قیامِ قیامت یہاں آرام فرما ہیں۔ یہ مقامِ جنت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تخلیق میں اس حجرے کے مقام کی مقدس مٹی کی جلوہ آرائیاں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا کسی جگہ موجود ہونا کتنا بڑا فضل ہے قرآن کا ارشاد ہے:

**وَما كانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ**[21]

اللہ ان مشرکین کو عذاب نہیں دے گا جب تک کہ آپ ان کے درمیان موجود ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا محض کسی جگہ کھڑا ہونا کس قدر کرم و رحمت کا باعث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کسی منافق کی قبر کے پاس کھڑا ہونے سے بھی منع کر دیا۔

**وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ**[22]

**۳۔** یہ درست ہے کہ دیگر ازواج کے گھر میں رسول اللہ ﷺ کی عدم تدفین ان کے نقص کی دلیل نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے یہ شرف ملنا حضرت عائشہؓ کے تفوق و فضل کی دلیل ہے۔ جس طرح خاتم النبیین ہونا رسول اللہ ﷺ کا شرف و فضل ہے لیکن یہ دیگر انبیا کے نقص و عیب کی دلیل نہیں۔

۴۔ اگر معترض کے نزدیک حجرۂ عائشہؓ میں رسول اللہ ﷺ کی عدمِ تدفین کا اثبات انؓ کے حق میں قدح نہیں اور تدفین کا اثبات ان کا فضل نہیں تو آخر کیا ضرورت پیش آئی کہ عدمِ تدفین کے حق میں استدلالات کیے جائیں۔ جب دو طرفہ صورت میں کچھ فرق نہیں پڑتا تو آخر انہوں نے امت کے اجماع و تواتر کے خلاف "عدمِ تدفین کا اثبات" کیوں پسند کیا؟

۵۔ اگر رسول اللہ ﷺ کا کسی مقام پر دفن ہونا اس مقام کے لیے، ساتھ دفن ہونے والوں کے لیے اور اس جگہ کی مالکہ کے لیے فضل نہیں تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ دفن ہیں یہ حجرۂ فاطمہؓ ہے، حجرۂ عائشہؓ نہیں؟ پھر جب کوئی شرف و فضل نہیں تو سیدنا حسن بن علی بن ابی طالبؓ نے اس مقام پر تدفین کی خواہش و کوشش کیوں کی؟[23]

## حوالے و حواشی

[1] ۔ ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، ابو عمر، القرطبی (المتوفی: ۴۶۳ھ)، الاستذکار، تحقیق: سالم محمد عطا، محمد علي معوض، دار الكتب العلمية، بیروت، طبع اول، ۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۰ء، ۳/ ۵۴

[2] ۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، ابو الفداء (المتوفی: ۷۷۴ھ)، البداية والنهاية، تحقیق: عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، دار هجر، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۷ء، ۸/ ۱۵۳

[3] ۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ (المتوفی: ۲۵۶ھ)، الادب المفرد، تحقیق: سمیر بن قمین الزهیری، مكتبة المعارف، الریاض، طبع اول، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۰

[4] ۔ مفتی محمد شفیع، مولانا، اوزان شرعیہ، ادارۃ المعارف، کراچی، طبع سوم، ۱۳۸۲ھ، ص ۴۶

[5] ۔ ڈاکٹر رانا محمد اسحاقؒ اور ڈاکٹر خالد مدنی نے اپنی تصنیف میں حجرۂ نبوی کے احاطہ سے متعلق یہ تحقیق بیان کی ہے۔

"مشرق سے مغرب تک جنوبی سمت قبلہ کی طرف ۱۵/فٹ،۶/انچ
مشرق سے مغرب تک شمال کی طرف ۱۵ /فٹ،۵/انچ
شمال سے جنوب تک مشرق کی طرف ۱۱ /فٹ،۵/انچ
شمال سے جنوب تک مغرب کی طرف ۱۱ /فٹ،۵/انچ"

(محمد اسحاق، ڈاکٹر خالد مدنی، مدینۃ النبی، ادارہ اشاعت اسلام، لاہور، پہلا ایڈیشن، ۲۰۰۹ء، ص۲۴۹)

[6] ۔ ابن سعد، محمد بن سعد، ابو عبد اللہ ، البغدادی (المتوفی:۲۳۰ھ)، **الطبقات الکبریٰ**، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۰ھ / ۱۹۹۰ء، ۲/۲۲۴

[7] ۔ السمھودی، علی بن عبد اللہ ، نور الدین ، ابو الحسن (المتوفی:۹۱۱ھ)، **وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی**، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۹ھ، ۲/۱۱۶

[8] ۔ **مدینۃ النبی**، ص۲۸۰

[9] ۔ المخلص، محمد بن عبد الرحمن، البغدادی (المتوفی:۳۹۳ھ)، **المخلصیات واجزاء اخری لابی طاھر المخلص**، تحقیق: نبیل سعد الدین جرار، وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ، قطر، طبع اول، ۱۴۲۹ھ / ۲۰۰۸ء، ۳/ ۲۶۷

[10] ۔ ابن شبہ، عمر بن زید، البصری، ابو زید (المتوفی:۲۶۲ھ)، **تاریخ المدینۃ** ، تحقیق: فھیم محمد شلتوت، ۱۳۹۹ھ، ۳/ ۹۴۵

[11] ۔ البخاری، محمد بن اسماعیل ،ابو عبداللہ ،**صحیح البخاری**، تحقیق: محمد زھیر بن ناصر الناصر، دار طوق النجاۃ، طبع اول، ۱۴۲۲ھ، ۱/ ۹۳، رقم حدیث: ۴۲۸، **كِتَابُ الصَّلاَةِ، بَابٌ: هَلْ تُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الجَاهِلِيَّةِ، وَيُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدَ**

[12] **وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفی**، ۲/۱۱۶

[13]- حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ المُثَنَّى، حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنْ هِشَامٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبِي، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: «كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصْغِي إِلَيَّ رَأْسَهُ وَهُوَ مُجَاوِرٌ فِي المَسْجِدِ، فَأُرَجِّلُهُ وَأَنَا حَائِضٌ» (صحیح البخاری، كِتَابُ الِاعْتِكَافِ، بَابُ الحَائِضِ تُرَجِّلُ رَأْسَ المُعْتَكِفِ، ۳/ ۴۸، رقم حدیث: ۲۰۲۸)

[14]- حَدَّثَنَا عَبْدُ العَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ، عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ، أَنَّ عَائِشَةَ، قَالَتْ: «لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا عَلَى بَابِ حُجْرَتِي وَالحَبَشَةُ يَلْعَبُونَ فِي المَسْجِدِ، وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِي بِرِدَائِهِ، أَنْظُرُ إِلَى لَعِبِهِمْ»(صحيح البخارى، كِتَابُ الصَّلاَةِ، بَابُ أَصْحَابِ الحِرَابِ فِي المَسْجِدِ، ۱/ ۹۸، رقم حدیث: ۴۵۴)

[15]- الادب المفرد ، ص۲۳۰، رقم حدیث: ۴۵۱

[16]- ابن حنبل، احمد بن محمد، ابو عبد اللہ، (المتوفی: ۲۴۱ھ)، **مسند الامام احمد بن حنبل**، تحقیق: شعیب الارنؤوط، عادل مرشد، وآخرون، اشراف: د عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، طبع اول، ۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۱ء، ۳۴/ ۳۶۵، رقم حدیث: ۲۰۷۶۶

[17]- الشثری، عبد الرحمان بن سعد بن علی ، **حجرة النبی ﷺ: تاريخها و احكامها**، مکتبۃ الملک الفہد الوطنیۃ اثناء النشر، الریاض، طبع اول، ۱۴۳۵ھ، تحت: **المسألة الخامسة: ابواب حجرة النبی ﷺ**، ص۳۹-۴۱

[18]- مالک بن انس المدنی (المتوفی: ۱۷۹ھ)، **الموطأ**، تحقیق: محمد مصطفی الاعظمی، مؤسسۃ زاید بن سلطان آل نہیان، ابوظبی، طبع اول، ۱۴۲۵ھ / ۲۰۰۴ء، ۲/ ۳۲۵، رقم حدیث: ۷۹۲

[19]۔ ابن حبان، محمد بن حبان، التمیمی، ابو حاتم (المتوفی: ۳۵۴ھ)،صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان، تحقیق: شعیب الارنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، طبع دوم، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء، ۱۴/ ۵۹۲، بَابُ وَفَاتِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ذِكْرُ:الْخَبَرِ الْمُدْحِضِ قَوْلَ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذَا الْخَبَرَ تَفَرَّدَ بِهِ عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ، رقم حدیث:۶۶۲۲

[20]۔ مسند احمد کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے: قَالَ مُحَمَّدٌ: وَالْمَسَاحِي:الْمُرُورُ (مسند احمد بن حنبل، رقم حدیث:۲۴۳۳۳، ۴۰/۳۹۱)، جناب مصطفیٰ اعظمیؒ نے مؤطا میں اس حدیث کے حاشیے میں لکھا ہے جمع كريز هو الفأس»، وفي ق «هي الفؤوس»، واحدها كرزن" وقع الكرازين» أي: صوت المساحي ومعناه: أخذتها دهشة،

[21]۔ الانفال، ۳۳

[22]۔ التوبہ، ۸۴

[23]۔ یہ اشکالات الشیخ علی آل محسن کے بیان کردہ ہیں۔ ان کا یہ مضمون هل دفن النبي صلى الله عليه وسلم في بيت عائشة؟جو http://arabic.al-shia.org پر موجود ہے۔

★★★★★

* ڈاکٹر یاسر فاروق

# عہدِ مغلیہ کے تعلیمی اقدامات و انصرامات
## تاریخی جائزہ

### تعارفِ موضوع

مغل بادشاہوں کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دور علمی اعتبار سے برصغیر کا سنہری دور ثابت ہوا بالخصوص جلال الدین اکبر نے شرح خواندگی کو بہتر بنانے میں خاص کردار ادا کیا۔اس سنہری دور میں منظم تعلیمی نظام کو فروغ دیا گیا جس میں دینی و عصری تعلیم کے تقاضے پورے ہوتے تھے نیز طب، فنون، ریاضیات، جغرافیہ اور علم جراحی جیسے عصری علوم میں خاطر خواہ پیش رفت ہوئی۔ جبکہ مغلیہ حکومت کے خاتمے اور انگریز حکومت کے دور کے آغاز سے ہی مسلمانوں کے علمی ستون گرتے گئے اور ان کی جگہ انگریزی تعلم نے لے لی جو آج تک مروج ہے۔زبان کی تبدیلی ثقافتی تبدیلی کا عندیہ ثابت ہوئی اور رفتہ رفتہ اہلِ برصغیر کے

---

* لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ غازی، ڈیرہ غازی خان

قلوب واذہان سے فکری و نظریاتی آزادی جاتی رہی جو کہ آج کی تعلیمی پالیسیوں سے واضح ہے۔ اہلِ مدارس کے فارغ التحصیل جو کہ مغلیہ دور میں بیوروکریٹس کی حیثیت تک فائز ہوتے تھے، انہیں آج معاشرہ وہ مقام دینے سے قاصر ہے۔

## مغلوں کے عہد میں تعلیم کے مقاصد

برصغیر میں مغلیہ دورِ حکومت نے دینی اور دنیوی تعلیم کو اجاگر کیا اور شرح خواندگی آج کے دور سے کس حد تک بہتر تھی۔ انگریز دورِ حکومت میں مسلمانوں کو اس نظامِ تعلیم سے دور کیا گیا۔ مدارس کے نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مدارس کے دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو شرح خواندگی میں شامل ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو حکومت میں کسی بھی نوکری پر بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ جب کہ جلال الدین اکبر کے دور میں مدارس سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو اچھے منصب پر تعینات کیا جاتا تھا یعنی کہ مغلیہ دورِ حکومت میں درس نظامی والوں کو بیوروکریٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ مغلوں کے دور میں تعلیم کے مقاصد کے بارے میں نصرت جہاں لکھتی ہیں:

"The objectives of education in Mughals Period of India have been stated as follows:

1. During the Muslim period, the education was meant to extend the knowledge and propagate Islam.
2. The impartment of education took place with the propagation of Islamic principles, laws and social conventions.
3. Education was based on religion and its main purpose was to make the individuals religious-minded.
4. The Muslim education aimed at the achievement of material wealth and prosperity.
5. The Mughal period made immense contribution in the system of education. During this period, the Mughal emperors acquired enormous understanding for learning and recognized the significance of education to a major extent"([1])

مغل عہد ہند میں تعلیم کے مقاصد کو حسب ذیل بیان کیا گیا ہے:

1. مسلم دور میں، تعلیم کا مقصد علم کو بڑھانا اور اسلام کی تبلیغ کرنا تھا۔
2. تعلیم کا حصول اسلامی اصولوں، قوانین اور معاشرتی رویوں کی تشہیر کے ساتھ ہوا۔
3. تعلیم مذہب پر مبنی تھی اور اس کا بنیادی مقصد افراد کو مذہبی ذہن سازی کرنا تھا۔
4. مسلم تعلیم کا مقصد مادی دولت اور خوشحالی کا حصول ہے۔
5. مغل عہد نے نظام تعلیم میں بے پناہ حصہ ڈالا۔ اس عرصے کے دوران، مغل شہنشاہوں نے سیکھنے کے لئے بہت زیادہ تفہیم حاصل کی اور ایک اہم حد تک تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کیا

غیر منقسم ہندوستان میں بھی مدارس کے قیام کی ایک زرّیں تاریخ ہے۔ عہدِ سلطنت میں اور بعد میں مغلیہ عہد میں ملک کے ہر حصہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ ان میں تمام مروجہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ان مدارس کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہتی تھی اور ان کا پورا خرچ سرکاری طور پر اٹھایا جاتا تھا۔ ہندوستان سے جب مسلمانوں کی حکمرانی ختم ہوئی اور اس پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو ان مدارس پر افتاد پڑی۔ سرکاری امداد سے محروم ہو جانے کی وجہ سے وہ بند ہو گئے۔ انگریزوں نے اپنا نظامِ تعلیم جاری کیا۔ اس کے تحت جو تعلیمی ادارے قائم کیے گئے وہ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تھے۔ سیاسی یلغار کے ساتھ فکری یلغار کی بھی زبردست کوششیں کی گئیں اور عیسائیت کو خوب بڑھاوا دیا گیا۔

## مغل دور میں تعلیم کے اہم مراکز اور ترویج لسانیات

مغل دور میں تعلیم کے اہم مرکز کے طور پر آگرہ، فتح پور سیکری، دہلی، گجرات، لاہور، سیالکوٹ، جونپور، اجمیر وغیرہ مشہور تھے۔ مغل دور کے حکمرانوں نے 'فارسی' کو اپنی سرکاری زبان قرار دے رکھا تھا مگر ان کے درباروں میں فارسی کے علاوہ سنسکرت کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں فارسی، عربی اور سنسکرت ہی نہیں بلکہ علاقائی زبانوں کو بھی فروغ ملا۔ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، بھوجپوری اور پوربی کو اسی زمانے میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا جو عوام کی زبانیں تھیں۔ اسی دور میں بنگال میں بنگالی زبان کو فروغ حاصل ہوا اور لٹریچر تخلیق پایا۔ اسی عہد

میں کشمیری زبان نے ترقی پائی اور اس میں ادب کی تخلیق ہوئی۔ رامچر تمانس (تلسی داس) سور ساگر (سورداس) اور پدماوت (ملک محمد جائسی) اسی زمانے کی تخلیق ہیں۔ بہت سی کتابیں حکومت کے تعاون کے بغیر بھی لکھی گئیں۔(2)

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں اگرچہ بادشاہوں کے یہاں بڑے بڑے علماوفضلا، منتخب روزگار اور اپنے اپنے فن میں یکتا افراد جمع رہتے تھے، لیکن عام آدمی تک تعلیم کی صورت حال اوسط ہی رہی۔ تاریخ میں عہد وسطیٰ میں کسی حکومت کا خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، محکمہ تعلیمات کا اندارج نہیں ملتا۔ ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں ایک خاص محکمہ بنایا گیا تھا، مذہبی امور اور تعلیمی اداروں کی دیکھ بھال کرنا جس کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ اس کے باوجود یہ بات بھی سچ ہے کہ ایسا کوئی قابل ذکر حکمراں نہیں گزرا جس کا نام کسی نہ کسی سطح پر اس کے عہد میں کسی مدرسے یا مکتب سے وابستہ نہ رہا ہو۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی مملکت میں ملک کے طول و عرض میں بہت سے مدرسے کھولے، کتب خانے قائم کیے اور علمی خدمات کی سرپرستی کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔

### مسجد بدرجہ مدرسہ

عہدِ مغلیہ میں اکثر و بیشتر مساجد میں تعلیم و تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ کیونکہ مسجد اسلامی معاشرے کے مستقل اور مرکزی ادارے کے طور پر ہر اسلامی دور میں اہم رہی ہے۔ مسجد صرف ایک عبادت خانہ نہیں بلکہ دربار، عدالت، مقام مشاورت، مکتب، اقامت گاہ، کتب خانہ، مطب، فنون لطیفہ کی نمائش اور اعلانات کے مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ اخلاق ساز ادارہ دینی اور دنیاوی تعلیم و تربیت کے لیے مخصوص رہا ہے۔ رسول اکرم عالم ﷺ نے مدینہ منورہ جاتے ہوئے مدینہ سے باہر مسجد قبا کی بنیاد ڈالی جو اسلام میں سب سے پہلی مسجد ہے۔ آپ ﷺ جب مدینہ پہنچے تو آپ نے "المربد" میں مسجد نبوی کی بنیاد ڈالی اور اس مسجد میں مسلمانوں نے دینی و دنیاوی تعلیم دینی شروع کی۔ تحققات سے معلوم ہوا کہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں مدینہ میں

نو اور مساجد تھیں جہاں تعلیم و تدریس کا مقدس فریضہ سرانجام دیا جاتا تھا۔ جن میں مسجد بنی زریق، مسجد بنی غفار، مسجد اسلم، مسجد جہنیہ، مسجد بنی عمرو، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلم، مسجد بنی رائے وغیرہ شامل ہیں۔(3)

مسجد اسلام کا روایتی ادارہ ہے جس کی ابتداء مسجد نبوی سے متصل اصحاب صفہ کی درس گاہ سے ہوئی جو باہر سے آنے والے طلبہ کے لیے دارالا قامہ کا کام دیتی تھی اور مدرسے کا بھی۔ پہلی صدی ہجری میں جہاں جہاں بھی اسلام کے قدم ہے، مسجد تعلیم کا مرکز رہی۔ تعلیم اور مسجد کا باہمی تعلق ہے۔ مسجد نبوی میں پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کر دیا اور بعد میں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس روایت کو فروغ دیا گیا اور اس کے ذریعے طلبہ کی زندگیاں ہمارے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔(4)

عہدِ مغلیہ میں بھی عموماً درس و تعلیم کے لیے الگ سے مستقل عمارتیں نہیں تھیں بلکہ اس کام کے لیے زیادہ تر مساجد سے کام لیا جاتا تھا جہاں باقاعدہ کلاسیں لگائی جاتیں اور لوگ ان مبارک حلقوں میں حصولِ تعلیم کے لیے شرکت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ہند کی قدیم مساجد میں دیکھیں گے جہاں صحن مسجد کے اردگرد کمروں کی قطاریں آج بھی نظر آئیں گی، یہ دراصل طلباء کے درس و قیام کے لیے تعمیر کیے جاتے تھے، جہاں دور دراز سے آئے مسافر طلباء قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم قدم پر آپ کو وسیع و شاندار مساجد ملیں گی، دلی، آگرہ، لاہور، ملتان، گجرات، احمد آباد، جونپور، حیدرآباد دکن وغیرہ قدیم اسلامی دارالسلطنتوں میں جو عظیم مساجد تعمیر ہوئیں تھیں، جو اب تک باقی ہیں ان کی موجودہ صورت و ہیئت دیکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان کا اکثر حصہ تعلیمِ دین کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

مذہبی رواداری کی ایک علامتی مثال کے طور پر مغل بادشاہ اکبر کا مشہور عبادت خانہ تھا، یہ عبادت خانہ اکبر کا ایک بڑا عبادت خانہ تھا۔ یہ عبادت خانہ اس نے ۱۵۷۵ء میں فتح پور سیکری میں قائم کیا۔ پہلے پہل اس میں صرف سنی مسلمان آپس میں بحث مباحثہ کرتے تھے مگر بعد میں یہ

ہندو، سکھ، عیسائی اور شیعہ سنی سمیت تمام مسلمان فرقوں کے لیے کھول دیا گیا۔ اکبر کی ابتدائی زندگی کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ ایک عقیدہ پرست مسلمان اور چشتی تصوف کا مداح تھا۔ کئی برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادھے مسلمان خوش اعتقاد ہوتے ہیں، اسی طرح احکام شرح کو صدق دل سے بجالاتا، باجماعت نماز پڑھتا، اذان کہتا، مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا، علما و فضلا کی تعظیم کرتا۔[5] ان سب کے باوجود اکبر روحانی بے چینی کا شکار تھا، بہت سے مسائل اسے پریشان کرتے، علم کی طرف رجوع کرنے کے باوجود اسے تسلی بخش جواب حاصل نہیں ہوتے تھے۔ یہ امر حیران کن ہے کہ اکبر نہایت خود اعتمادی خود رائے ہونے کے باوجود مذہبی تشکیک کا شکار ہو گیا جو واضح طور پر جلتی تحریک اور آزاد خیال صوفیہ کے خیالات کے فروغ سے پیدا ہوئی تھی۔ روحانی تسکین کے لیے اس نے مختلف مذاہب کے ارباب علم و دانش کی طرف رجوع کیا اور اس کی ابتدا مسلمانوں کے ہی مختلف مسالک کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش سے ہوئی اس مقصد کی خاطر اکبر نے 1510ء میں شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے قریب ایک عمارت تعمیر کروائی، جسے عبادت خانہ کا نام دیا گیا۔ اس عبادت خانے میں مختلف فرقوں کے علما کو مدعو کیا جاتا، جو اختلافی مسائل پر ایک دوسرے سے بحث کرتے تھے۔ خود اکبر ہر جمعہ کی سہ پہر کو ان مباحثوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔(6)

عبادت خانے کے مباحث نے اکبر کے ذہن پر بھی اچھے اثرات مرتب نہ کیے۔ اکبر ان مباحث میں شرکت کرنے والے علما کے سابی رویے سے دل برداشتہ ہوا۔ کیوں کہ ان لوگوں نے پہلے موقع پر ہی نشستوں کی ترتیب پر ایک دوسرے سے الجھنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایسی محافل میں علم و فکر کی بجائے شہنشاہ اکبر سے قربت کے حوالے سے ان کی عظمت کا تعین ہو گا اس مسئلے کو حل کرنے کی خاطر ارباب علم کو جنوب، اہل طریقت کو شمال، امراکو مشرق اور سادات کو مغرب میں جگہ دینے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد جب عبادت خانہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو

اکبر یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کو گم راہ تصور کرتا ہے۔ اس صورت حال نے علم و دانش کے ان دعوے داروں سے اکبر کو بیزار کر دیا۔(7)

درج بالا صورت حال کے بعد بھی اکبر کی ذہنی جستجو ختم نہیں ہوئی۔ عبادت خانہ کے مباحث میں ابو الفضل کے آنے کے بعد اور جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اکبر نے ان مباحث میں دیگر مذاہب کے علما کو بھی شامل کیا یہاں تک کہ یہ عبادت خانہ بین المذاہبی مرکز بن گیا۔ 1572ء میں تین عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی، ان کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ جب پچھلے چند سالوں میں اکبر کو بڑی بڑی فتوحات میں اور مملکت کی حدود میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا، ملکی نظم و نسق حسب منشا قائم ہو گیا تو اس کی توجہ زیادہ تر عبادت و ریاضت کی طرف ہو گئی۔ چناں چہ اجمیر کی درگاہ اور درویشوں کے ساتھ محبتیں رہنے لگیں اور اس کے زیادہ تر اوقات اللہ و رسول کے تذکرے میں گزرنے لگے۔ ان محافل میں وہ تصوف کی باتوں، فقہی مسائل اور علمی مباحث میں مصروف رہتا، راتوں کو بھی اٹھ کر عبادت کرتا رہتا۔ کسی نے ''یاہو'' اور ''یاہادی کا وظیفہ بتادیا عموما راتوں کو فرش پر بیٹھ کر مراقبہ کرتا اور یہ وظیفہ پڑھا کرتا۔ ان دنوں اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بڑا اثر تھا۔ حاکم بنگالہ سلیمان کررانی کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ مشائین اور علما کے ساتھ تہجد کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا اور فجر کی نماز تک ان علما کی مجالس میں تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا، فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ملکی معاملات، فوج اور لشکر کے حساب کتاب میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے اس معمول میں بھی فرق نہیں آتا تھا۔ اکبر نے بھی اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ ان دنوں میرزا سلیمان کی آمد کی اطلاع تھی، مرزا سلیمان صوفی منش، صاحب حال بادشاہ تھا، صاحب بیعت بھی تھا۔ لوگ اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت کیا کرتے تھے۔ لہذا اکبر نے شوق عبادت اور کچھ آنے والے معزز مہمان کی خاطر شیخ عبد اللہ نیازی کے حجرہ پر ایک بڑی عبادت گاہ تعمیر کروائی۔ عبد اللہ نیازی شیخ الاسلام سلیم چشتی کے مرید تھے بعد میں مہدوی سلسلے سے وابستہ ہو گئے۔ اس عبادت گاہ کے چاروں طرف ایک وسیع ایران اور نواب تلاونامی حوض تیار

کر لیا گیا اور اس حجرے کو عبادت خانہ کا نام دیا جو بعد میں عبادت خانہ ہو گیا اس کا معمول تھا کہ ہر جمعے کی نماز کے بعد شیخ الاسلام کی خانقاہ سے اس عبادت خانہ میں آکر مجالس منعقد کرتا۔ ان محافل میں نام ور علماء مشائخ اور قریبی دوست شامل ہوتے، دوسرے لوگوں کو اس میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس محفل میں علمی مباحث اور مذاکرے ہوتے۔ اس عبادت خانے میں ہر جمعے کی رات بھی ایک محفل منعقد ہوئی جس میں سادات، مشائخ، علم اور امرا بھی حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشست لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا ہو جاتا اس لیے اکبر نے با قاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا۔ اور باری باری ہر ایک کی نشست گاہ پر جا کر ان کے مباحث میں حصہ لیتا۔[8] اس کے علاوہ عہد جلال الدین میں مذہبی رجحانات کو سمجھنے کے لیے معمول اکبر کچھ یوں ہے فتح پور آنے کے بعد اکبر اپنا زیادہ وقت عبادت خانے میں علما کی محفل میں گزارتا۔ جمعے کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں، دینی علوم اور اصل و فرع کی باتیں جاری رہیں۔ ان مجالس میں علما ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی غرض سے اس حد تک اختلاف میں آگے چلے جاتے کہ دوسروں کے لیے تکفیری کلمات بھی کہہ جاتے۔[9] اکبر کا اصول اعظم یہ تھا کہ نیکی ہر ایک مذہب میں ہے پس ہمیں چاہیے کہ نیکی اختیار کر لیں اور باقی ماندہ ترک کر دیں۔ اس کا اس بات پر بھی اعتقاد تھا کہ ہر ایک انسان میں کچھ نہ کچھ خوبی ہوتی ہے اس لیے وہ اکثر درگزر سے کام لیتا، جب تک اصلاح کی امید رہتی تھی سزا دینا پسند نہ کرتا۔ معاف کر کے بہت خوش ہوتا تھا اس کے طریقے کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ گنہگار سے کہنا کہ اب تو چلا جا پھر گناہ نہ کرنا۔([10])

## عہدِ مغلیہ میں تعلیم کے مختلف ادوار اور نصاب

رسول اللہ ﷺ ﷺ مسلمانوں کے پہلے معلم تھے اور صفہ مسجد نبوی پہلا باقاعدہ اسلامی دارالعلوم تھا۔ یہاں نصاب تعلیم کا مرکز و محور قرآن حکیم تھا۔ زمانہ رسالت کے بعد خلفائے راشدین کے عہد میں قرآن و حدیث شامل نصاب رہے۔ حضرت عمر کے دور میں شعر و ادب بھی شامل نصاب ہو گئے۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم فہم قرآن و حدیث کے لیے مدد تھی۔ عربی زبان

چونکہ قرآن و حدیث کی زبان ہے لہذا اس کے متعلقہ علوم یعنی نحو، صرف، لغت اور معانی بھی شامل نصاب ہو گئے۔ احادیث کی جانچ پرکھ کا سوال ہوا تو علم اسماء الرجال ظہور پذیر ہو کر نصاب کا جزو بن گیا۔ دینی اور دنیوی علوم میں قرآن و حدیث اور فقہ و تفسیر کے علاوہ تاریخ و فلسفہ، شعر و ادب، کتابت و خطابت، نقاشی و خوشنوی، علم کیمیا اور موسیقی جیسے علوم و فنون بھی عہد بنو امیہ میں شامل نصاب ہو گئے۔ دور عباسیہ میں قرآن و حدیث کے علاوہ قرآن و کتابت، خوشخطی، عربی گرائمر اور سیرت نبوی ﷺ کے متعلق تاریخی حقائق نیز علم حساب اور صرف و نحو کی مبادیات کی تعلیم بھی شامل نصاب تھی۔ اس دور میں مروج نصاب تعلیم میں شامل علوم کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا گیا۔ اولاً وہ علوم جن کا تعلق تفہیم القرآن سے ہے۔ ان میں قرآۃ و تفسیر، فقہ، کلام، صرف و نحو، شعر و ادب اور لغت و بیان جیسے علوم شامل ہیں۔ دوم وہ علوم جو مسلمانوں نے غیر عربوں سے حاصل کیے، انہیں علوم عقلیہ کہتے ہیں۔ ان میں فلسفہ، اقلیدس، طب، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، موسیقی اور نجوم شامل ہیں۔

عہدِ مغلیہ میں رائج نصاب تعلیم کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔([11]) ذیل میں اسی بنیاد پر اختصار کے ساتھ عہد وسطیٰ میں ہندوستانی مسلمانوں کے نصاب تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے:

**پہلا دور:** اس کا آغاز ساتویں ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا، کم و بیش دو سو برس تک اِن فنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی: صرف، نحو، ادب، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث۔ اس طبقے کے علماء کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علم فقہ معیار فضیلت تھا، حدیث میں صرف **مشارق الانوار** کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور حدیث میں مزید درک و مہارت کے لئے مصابیح آخری کتاب تھی۔ اس زمانے کے نصاب تعلیم میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ فاتحین ہند کے موئثر اور نکھرے ہوئے مذاق کا نتیجہ تھیں، ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بساط جن لوگوں

نے بچھائی وہ غزنی اور غور سے آئے تھے، یہ وہ مقامات تھے جہاں فقہ اور اصول فقہ کا ماہر ہونا علم و فن کا طرز امتیاز سمجھا جاتا تھا اور ان ممالک میں فقہی روایات کا پایہ بہت بلند تھا۔

**دوسرا دور:** نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے دہلی سلطان سکندر لودھی کے دربار میں آئے اور انھوں نے سابقہ معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لئے قاضی عضد الدین کی تصانیف مطالع و مواقف اور علامہ سکاکی کی مفتاح العلوم نصاب میں داخل کیں۔ اس دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول و مختصر المعانی اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ نیز اس زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح جامی داخل نصاب کی گئیں، اس دور کے آخر میں شیخ عبد الحق محدث دہلوینے علمائے حرمین شریفین سے علم حدیث کی تکمیل کرکے علم حدیث کو فروغ دینے کی کوشش کی، ان کے بعد ان کے فرزند شیخ نور الحق نے بھی درس حدیث کی اشاعت کی کوشش کی۔ اس طبقے کے علمائے کرام کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مفتاح العلوم سکاکی اور قاضی عضد الدین کی مطالع اور مواقف کتابیں تھیں۔

**تیسرا دور:** دسویں صدی کے اخیر میں میر فتح اللہ شیر از (ایران) سے ہندوستان آئے، اکبر نے ان کو عضد الملک کا خطاب دے کر پذیرائی کی، انہوں نے سابق نصاب درس میں کچھ معقولی کتابوں کے اضافے کئے اور انھیں کے زیر اثر ہندوستانی نصاب میں ان کا رواج ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جو اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے، حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں چودہ ماہ قیام فرما کر علم حدیث کی تکمیل کی اور ہندوستان آکر اس سرگرمی سے اس کی اشاعت کی کہ جس کے اثرات آج تک باقی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف نے صحاح ستہ کے درس و تدریس کو اپنی سعی و کوشش سے جزو نصاب بنادیا۔ شاہ صاحب نے ایک نیا نصاب درس بھی مرتب کیا تھا مگر چونکہ اس زمانے میں علم کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا، نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں ایران سے جو نیا تعلق ہوا تھا، اس نے بتدریج ہندوستان کے علمی

مذاح میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا، مغل دربار کے ایرانی امراء اور علماء کے ذریعے منطق اور فلسفہ کو آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت حاصل ہوتی گئی؛ اس لیے شاہ صاحب کے نصاب کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔

**چوتھا دور:** چوتھا دور بارہویں صدی ہجری سے شروع ہوا، اس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی تھے جن کا مرکز فرنگی محل لکھنؤ تھا۔ درس نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارس عربیہ میں رائج ہے وہ ان ہی کی یادگار ہے۔ ملا نظام الدین نے دور سوم کے نصاب میں اضافہ کر کے ایک نیا نصاب مرتب کیا اور اس دور میں پڑھائی جانے والی کتابوں کو حتی الامکان جمع کرنے کی کوشش کی۔ درس نظامی میں تیرہ موضوعات کی تقریباً چالیس کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ فقہ اور اصول فقہ کے ساتھ، تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیث میں مشکاۃ المصابیح داخل تھی۔ انھوں نے ریاضی اور فلکیات کی کئی کتابیں اور ہندسہ (انجینئرنگ) پر بھی ایک کتاب شامل نصاب کی۔ اس میں طب، تصوف اور ادب کی کوئی کتاب شامل نہیں تھی اور منطق و فلسفہ کو خاصی جگہ دی گئی۔([12])

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی اعلیٰ درس گاہوں میں ہزارہا طلبا سبق میں حصہ لیا کرتے تھے، بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات ایک استاد کے درس میں سیکڑوں طلبا شریک ہوتے تھے۔ وہ ملک میں علم و فن کی ترقی کا باعث بھی بنے اور اس کے نتیجے میں ملک میں بڑے بڑے ادبا، شعرا اور عالم و فاضل پیدا ہوئے اور انہیں بادشاہوں کے یہاں سے اہم مسندیں عطا کی گئیں۔ یہ تمام تعلیم کا انتظام مفت ہوتا تھا۔ غریب اور ہونہار طلبا کو قیام و طعام کے ساتھ ساتھ وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ ان مدارس میں امیر و غریب کے بچوں میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔ اساتذہ ان کی تعلیم پر ایک ہی انداز میں نگاہ رکھتے تھے۔ حکومتی سطح پر تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں بڑی بڑی جائدادیں اور جاگیریں وقف کر دی جاتی تھیں، بلکہ اس زمانے میں کتابوں کی طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا، جو تعلیم کی ترقی اور

اشاعت میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ مگر ہاتھ سے کتابیں لکھنے کا رواج خوب تھا، اس کے لیے کاتب رکھے جاتے تھے۔ اس سے فن کتابت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ خوش نویسی اور خطاطی کے اس دور کے بہت سے نمونے ملک اور بیرونی ممالک کی مختلف لائبریریوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

المختصر عام طور پر تعلیم کے حصول کے تین ذرائع تھے۔ مکتب اور مدرسے، مساجد اور خانقاہیں اور بعض مخصوص گھرانے۔ اس زمانے میں بھی اعلیٰ تعلیم تک بہت قابل ذکر طلبا ہی پہنچ پاتے تھے، لیکن عام طور پر تعلیم کا حصول بہت مشکل نہیں تھا۔ تقریباً تمام مساجد اور خانقاہوں میں جو مدرسے قائم تھے، ان میں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا۔ مسلم عہد حکومت کی تعلیم کے معیارات کا آج کے زمانے کی تعلیمات سے موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معیار بہت بلند تھا۔ ایک ہی شخص کئی حیثیتوں سے ممتاز ہوتا تھا۔ حالاں کہ اگر اس دور اور آج کے دور کے زمانی فرق پر غور کیا جائے اور جدید تعلیم و ترقیات کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر بھی نتائج میں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ ایک سب سے بڑا جو فرق ہے وہ تربیت کا ہے، اس زمانے میں جو تربیت ہوتی تھی، آج اس کا فقدان ہے۔

تیرہویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مرکز قائم تھے؛ دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد۔ گو نصاب تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے۔ دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مشغول تھا، یہاں تفسیر و حدیث پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی، علوم معقولہ کی حیثیت ثانوی درجے کی تھی۔ لکھنؤمیں علمائے فرنگی محلّی پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا، فقہ اور اصول فقہ کو ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیث میں صرف مشکاۃ المصابیح کافی سمجھی جاتی تھی۔ خیر آبادی مرکز کا علمی موضوع صرف منطق و فلسفہ تھا اور یہ علوم اس قدر اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

جلال الدین اکبر کے دور میں ایسے علمی انقلابات رونما ہوئے جو اس سے پہلے مسلمانوں کے دور خلافت میں کبھی بھی رونما نہ ہوئے تھے۔اکبر کے دور میں ہونے والے نمایاں علمی انقلابات دراصل اس کی فکر اور روشن خیالی کو ہی ظاہر کرتے ہیں۔اکبر نے مذہبی آزادی پر زور دیا,دیگر مذاہب کے اہل علم افراد کو اپنے دربار میں جگہ دی,علمی مناظرے کروائے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں نے بڑی تندہی سے اپنے مقدس متون کے تراجم کئے۔حتیٰ کہ رزم نامہ کے عنوان سے اکبر نے مہابھارت کا پہلا فارسی ترجمہ کروایا جس سے ہندو مذہب کو ترویج ملی۔اکبر نے شیعہ اہل علم بالخصوص ملا فتح اللہ شیرازی کو اپنے مصاحبین میں شامل کر کے شیعہ مسلک کو فروغ دیا۔اکبر کے دین الٰہی کی ایجاد کی بدولت مذہبی تصورات و عقائد میں خلل اندازی ہوئی۔اکبر کے دور میں پہلی بار ہندو اور مسلمان بچے ایک ہی مکتب میں علم حاصل کرتے تھے۔اس نے عربی کی طرح سنسکرت کی تعلیم لازمی قرار دی۔اس نے ہندو ثقافت کو فروغ دیا جس کی واضح مثال مہابھارت کے ترجمہ کی صورت سامنے آئی۔

اکبر کے دین الٰہی نے برصغیر کو ایک نئی سمت پر چلا دیا کیونکہ اکبر کا دین الٰہی بہت سے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ تھا۔اس کی بدولت مذاہب کی پیروی میں اختلاط رونما ہوا۔الغرضیکہ اکبر نے تمام مذہبی اصولوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے سلطنت میں ایسے اصول رائج کئے جو خالصتاً اکبر کی فکر کی عکاسی کرتے تھے۔لیکن ان کے اثرات نے برصغیر میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔مغل بادشاہ جلال الدین اکبر اپنے دور کی انقلابی شخصیت تھی,خود ان پڑھ ہونے کے احساس نے اکبر کے دل میں علم کی جستجو کی وہ شمع روشن کی جس سے آنے والی کئی نسلوں نے جِلا پائی۔

اکبر علم و دانش کا متوالا تھا۔کم عمری میں علم کی طرف سے بے رغبتی کے باوجود اس نے جب اقتدار سنبھالا تو سب سے زیادہ توجہ اسی کمزور پہلو کی طرف مرکوز کی۔وقت کے اہل علم اس کے دربار میں ضخیم کتب کے تراجم کرتے ہوئے اور اس کے مصاحبین بنتے نظر آتے ہیں۔اکبر ایک ذہین انسان تھا اور اس بات کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا کہ تاریخ کے اہم کارناموں کو کتب کے

اوراق میں محفوظ کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کتب خانوں کی تعمیر,شہزادوں اور شہزادیوں کی علمی تربیت اور دیگر زبانوں کے تراجم پر خصوصی توجہ دی۔

اکبر کا دور علمی اعتبار سے عبوری دور تھا۔کیونکہ اس دور میں تمام مذاہب سے وابستہ اہل علم شہنشاہ کے دربار میں بلا روک ٹوک حاضر ہوسکتے تھے,بلکہ تمام مذاہب سے وابستگان کے درمیان علمی مکالمہ کروانا مغل بادشاہ اکبر کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ایسی مباحث اس کے دربار میں رات بھر چلا کرتیں۔اکبر کے دینی نظریات میں بہت وسعت تھی,حتی کہ وہ دین کو خواہشات کے تابع کرنے کو بھی برا خیال نہ کرتا۔یہی وجہ ہے کہ اس کے دور میں نیا دین'دین اکبری'ایجاد ہوا۔اکبر اگرچہ علمی وارفتگی کا حامل تھا لیکن اس کے علمی نظریاے فقط ایک دین کے تابع نہ تھے۔

## علوم وفنون کی ترویج

محمد ﷺ نے ہر قسم کے مفید علوم وفنون کے سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ صحت زبان کے اہتمام کی تلقین کی۔ فن کتابت کے لیے ہدایت دی۔ صحابہ کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم حاصل کرنے پر متوجہ کیا۔ حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔([13]) نوجوانوں کو تعلیم جہاد دینے کے لیے دوڑ اور تیر اندازی کے مقابلے کرائے۔ عین میدان جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو مقام جرش کی طرف بھیجا۔ قرآن پاک میں ہے:

**وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ([14])**

اور ان کے لئے تیار رکھو جو قوت تمہیں بن پڑے اور جتنے گھوڑے باندھ سکو کہ ان سے ان کے دلوں میں دھاک بٹھاؤ جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان

سے سوا کچھ اوروں کے دلوں میں جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کروگے تمہیں پورا دیا جائے گا اور کسی طرح گھاٹے میں نہ رہوگے۔

اسلامی نظام تعلیم نے دنیائے علم و دانش میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ مختلف علوم و فنون میں بے شمار تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آئیں اور نئے نئے علوم ایجاد ہوئے۔([15]) نصاب کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ جو مضامین ان مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے یا جو اس وقت پڑھائے جاتے ہیں، ان کا تعلق صرف قرآن و حدیث اور متعلقہ مضامین سے ہے۔ دوسرے مضامین یا تو پڑھائے نہیں جاتے یا ان کے نفس مضمون قطعی دور از کار ہیں جن میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ کوئی تسلسل۔ یہ بات اتنی بھی نہیں ہے جتنی آسانی سے کہہ دی جاتی ہے۔ ان تعلیم گاہوں میں علم کی ہر نئی جہت کا ایک مقام تھا اور تدریس و تحقیق کی نوعیت کے اعتبار سے اس کا اہتمام ہوتا تھا۔([16])

عہدِ مغلیہ میں علوم و فنون کو پزیرائی ملی۔ اس دور کے فن پارے آج بھی یگانہ روزگار ہیں اور ان کا کوئی ثانی نہیں۔ فن تعمیر ہو یا مصوری یا موسیقی کے راگ، خطاطی و نویس نگاری ہو یا لسانی قوتِ تسخیر، عہدِ مغلیہ میں ہر فن کو بامِ عروج بخشا گیا۔

## تعلیم نسواں

رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات عورتوں کی تعلیم کا اہم ذریعہ بن گئیں۔ خاص طور پر حضرت عائشہ نے عورتوں کی تعلیم کا اہتمام فرمایا۔ آپ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

**خذو نصف دينكم عن الحميرا([17])**

نصف دین تم حمیرا (حضرت عائشہ) سے سیکھو۔

لہذا نہ صرف عورتیں حضرت عائشہ سے تعلیم پاتی تھیں بلکہ صحابہ کرام بھی آپ سے علمی فیض پاتے تھے۔ چنانچہ مسروق کہتے ہیں:

**واللہ لقد رأیت أصحاب محمد الاکابر یسالوھا عن الفرائض**(18)

خدا کی قسم میں نے بہت پڑھے لکھے صحابہ کرام کو حضرت عائشہ سے علم الفرائض کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے دیکھا۔

عہدِ مغلیہ میں شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم و تربیت اور مختلف مہارتوں کے لئے اتالیق مقرر کئے جاتے۔ شہزادوں کو بالخصوص حکومتی عہدیداروں کی حیثیت سے تیار کرنے کے لئے دور دراز علاقوں میں بھیجا جاتا تاکہ عوام کے حالات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ مغل شہزادوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا بھی انتظام کیا جاتا۔ جس کے اثرات یوں رونما ہوتے کہ وہ جسمانی لحاظ سے قوی ہوتے اور دشمنوں کے مقابلہ میں مختلف مہارتیں مثلاً نیزہ بازی، گھڑ سواری، تلوار بازی وغیرہ سیکھ جاتے۔ شہزادوں نے چونکہ تخت نشینی کی فرائض انجام دینے کی بھی تیاری کرنی ہوتی تھی لہذا ان کی تربیت اسی انداز سے کی جاتی۔ شہزادوں کو گھڑ سواری، تلوار بازی، نیزہ بازی وغیرہ کی تربیت دی جاتی اس کے ساتھ ساتھ ان کی علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا اہتمام کیا جاتا۔ شہزادوں کی اگر تعلیم پرانے مسلمانوں کے طرز کی ہوتی، یعنی قرآن کی تلاوت ، تھوڑی بہت مذہب کی واقفیت اور فقہ کی لفظی موشگافیاں ان کی ساری ذہنی کائنات ہوتی تھی۔ چونکہ شہزادوں کے لئے ممتاز اور اعلیٰ پائے کے علماء و فضلاء بطور اساتذہ مقرر کئے جاتے تھے لہذا شہزادوں میں علمی ذوق پیدا ہوا۔ علم کا وہ مقام جو بادشاہ اکبر کو حاصل نہ تھا، اس کے شہزادے اس پر فائز ہوئے۔ شہزادوں کو تعلیم اگرچہ درباری زبان یعنی فارسی میں ہی دی جاتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں دیگر زبانیں سکھانے کا خاطر خواہ انتظام کیا جاتا تھا مثلاً عربی اور ترکی وغیرہ۔ اس لئے مغلیہ سلطنت کے شہزادوں میں دیگر زبانیں سیکھنے کی بدولت مختلف تہذیبوں کو سمجھنے اور جاننے کا ذوق عروج پر تھا۔ اس کی بدولت مختلف زبانوں اور ان کی اصطلاحات کو فروغ ملا۔ شہزادوں کی دینی تعلیم کے لئے سلطنت سے اعلیٰ پائے کے علّام کا اہتمام کیا جاتا۔ جس کی بدولت شہزادوں میں دینی رجحانات پیدا ہوتے اور وہ دین کی بنیاد پر فیصلے کرنے کی اہمیت سمجھتے۔

شہزادوں کی روحانی تربیت کے لئے بادشاہ اکبر نے خانقاہی نظام کو ترویج دی۔ تزکیہ نفس کے حصول کے لئے خانقاہوں کے درویش صفت شیوخ سے رجوع کیا جاتا۔ بادشاہ اکبر کے دور میں خانقاہوں کو کافی ترویج ملی۔

البتہ مغلیہ دور کے تعلیمی اثرات کا جائزہ اگر خواتین کے حوالہ سے لیا جائے تو اس میں کوئی خوش آئند نتائج سامنے نہیں آتے۔ کیونکہ یہ وہ دور تھا جس میں عام مسلمان عورتوں کی تعلیم پر بالکل توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ شہزادیاں اس سے مستثنیٰ تھی۔ مغل بادشاہوں کے دور میں سلطنت کی عورتوں یعنی شہزادیوں پر تعلیم کے حصول کی کوئی قدغن نہ تھی۔ وہ جس قدر چاہیں تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی نامور فارسی خواتین شعراء میں اکثر شہزادیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ (19) مغلیہ سلطنت کی شہزادیوں کے تعلیمی اثرات ہی تھے کہ وہ سلطنت کے اکثر امور میں غور و فکر سے کام لیتے ہوئے وقت کے بادشاہوں کو صلاح مشورہ بھی دیا کرتی تھیں۔ مغلیہ سلطنت کی خواتین بہت سے ہنر سیکھا کرتی تھیں اور مہارتیں سیکھنے میں مردوں کے شانہ بشانہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سلطنت کے امور چلانے میں مدبرانہ صلاحیت کی حامل تھیں اور یہ بات انہیں بادشاہ کے لئے ہر دلعزیز بنا دیا کرتی تھی۔

## قدیم خانقاہیں

قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم و تربیت کا اہم مرکز سمجھی جاتی تھیں، جہاں صرف مجاہدۂ نفس اور وظائف کو ہی عبادت نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ تزکیۂ نفوس کی تعلیم دی جاتی اور احکاماتِ شریعت پر عمل پیرا ہونے کا بھی درس دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دہلی میں درج ذیل مشہور اور عظیم الشان مدارس موجود تھے۔ مدرسہ بالا بند آب سیری، یہ مدرسہ ایک شاہی عمارت میں واقع تھا، جس کے حسن کا کوئی عمارت مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مدرسہ خیر المنازل جسے عہدِ اکبری میں ماہم بیگم نے ۹۶۹ء میں پرانے قلعہ کے پاس مغربی دروازے کے مقابل تعمیر کرایا تھا۔

دلی کی جامع مسجد کے جنوبی رخ پر دارالبقاء کے نام سے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم تھا، جس کی بنیاد اندازاً ۱۰۶۰ء میں رکھی گئی۔ دلی کا سب سے آخر الذکر اور مشہور مدرسہ شاہ عبدالرحیم دہلوی والدِ بزرگوار شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہما الرحمۃ کا ہے۔ اسی مدرسہ کی آغوش میں شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، شاہ اسمٰعیل، شاہ اسحاق، شاہ عبدالقادر وغیرہ جید کبار اہلِ علم پڑھ کر جواں ہوئے ہیں، یہی وہ عظیم مدرسہ ہے جہاں سے پورے ہند میں حدیث کے چشمے پھیلے۔ علامہ مقریزی نے اپنی مشہور کتاب **کتاب الخُطط** میں لکھا ہے:

> چودہویں صدی عیسوی میں محمد تغلق کے دور میں صرف دہلی شہر میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ کیپٹن ہیلیگزن ہملٹن مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں ۱۶۹۹ء میں اس خطے میں آئے تھے، انہوں نے اپنے سفر نامے میں لکھا۔ صرف ٹھٹھہ شہر میں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدارس تھے۔ کیئر ہارڈی نے میکس پولر کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ " انگریزوں کی علمداری سے قبل بنگال میں اسّی ہزار مدرسے موجود تھے، تقریباً ہر چار سو افراد کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ (20)

دورِ مغلیہ میں مذہبی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ ہوسٹلز کی صورت مساجد میں رہائشی کمرے فراہم کئے گئے۔ غور و فکر کے بہت راستے روشن ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکبر کا مذہبی رجحان مختلف تھا۔ اکبر کی ناخواندگی کے اثرات یوں ظاہر ہوئے کہ اس نے دینِ الٰہی کو جنم دیا۔ اکبر کے اس خود ساختہ دین کی وجہ سے وہ خود تو گمراہی کا شکار ہوا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں پر بھی اپنے افکار لاگو کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا۔ اکبر کا دور مذہبی پسماندگی کا دور ہے کیونکہ اس دور میں مذہبی مسلمات کو شدید نقصان پہنچا۔ اکبر نے دین کی ان تعلیمات کے خلاف علم بلند کیا جن پر عمل کرنے سے ہی ایک دینی سلطنت کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ اُمراء نے بھی تعلیم میں تربیت میں اہم کردار ادا کیا جن میں شہنشاہ اکبر کی دایہ ماہم انگہ نے ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا اور اس کے ساتھ خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ یہ ان کی علم دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بیرم

خان کا بیٹا عبد الرحیم خان خانان دربارِ اکبری کے ممتاز تریں امراء میں تھا، علم و فن کی سرپرستی میں مشہور تھا، فارسی، ترکی، عربی، اور ہندی نظم و نثر بے تکلف لکھتا تھا۔ اکبر کے امرا نے جس وسعت قلب اور دریادلی سے علم و فن اور تعلیم و تدریس کی خدمت کی۔

## تزک بابری

مغل بادشاہ عربی، فارسی اور ترکی کے ماہر اسکالر تھے۔ وہ ترک نظموں کے مشہور مصنف تھے۔ بابر اپنی فارسی ساخت (ابو الفضل) کے لئے بھی مشہور تھا۔ بابر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے:

> He composed a book entitled Mufassal. He had also skill in music. Babor initiated a form of handwriting"The Babarui handwriting" and wrote a copy of the Koran in that script. Fond of books as he was, Babor took possession of Ghazi Khan's library. He was also a lover of paintings. Babor made the diffusion of education a duty of the state. Babor had a society of literary men. Babor's Shurhrat-am (Public works Department) was entrusted with the duty of publishing a Gazette and buildings and colleges.([21])

بابر نے اپنے لکھنے کی ابتداء تزک بابری سے کی۔ اس نے ہاتھ سے قرآن مجید لکھا۔ کتابوں کا اتنا شوقین تھا کہ غازی خان لائبریری پر قبضہ کر لیا۔ وہ جمالیات کا بھی بہت شوقین تھا۔ بابر نے تعلیم کے پھیلاؤ کو اپنا فرض بنالیا تھا۔

اگرچہ اکبر کے دور میں بہت سے کتب خانے بھی تعمیر ہوئے اور اکبر نے آگرہ کے کتب خانوں کو دہلی منتقل کروادیا تاکہ دہلی علم کا مرکز قرار پائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نئی کتابت کی صورت علمی کتابوں کی بجائے آرٹ پر زیادہ توجہ دی کیونکہ وہ فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اکبر کا دور علمی اعتبار سے عبوری دور تھا۔ کیونکہ اس دور میں تمام مذاہب سے وابستہ اہل علم شہنشاہ کے دربار میں بلا روک ٹوک حاضر ہوسکتے تھے, بلکہ تمام مذاہب سے وابستگان کے درمیان علمی مکالمہ کروانا مغل بادشاہ اکبر کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایسی مباحث اس کے دربار میں رات بھر چلا کرتیں۔ اکبر کے دینی نظریات میں بہت وسعت تھی, حتی کہ وہ دین کو خواہشات کے تابع کرنے کو بھی برا خیال نہ

کرتا۔یہی وجہ ہے کہ اس کے دور میں نیا دین 'دین اکبری' ایجاد ہوا۔اکبر اگرچہ علمی وارفتگی کا حامل تھا لیکن اس کے علمی نظریات فقط ایک دین کے تابع نہ تھے۔

ان کے دربار میں اکثر مذاہب پر مکالمہ جاری رہتا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کی دیگر مذاہب میں دل چسپی بڑھتی گئی۔ دور اکبری میں عبادت خانوں میں اسلامی فرقوں کے علاوہ مسیحی، پارسی، ہندو غرض ہر مذہب کے علما کو شرکت کی دعوت دی گئی اور ہر ایک کے عقائد و شعائر سیکھنے کی کوشش کی گئی۔ اکبر کی ریاستی پالیسی کے دو پہلو تھے، ایک انتظامی اور سیاسی معاملات میں صلح کل کی پالیسی اور دوسرے شاہی درباریوں کے لیے قواعد وآئین کا وہ مجموعہ جسے بدایونی اور ابو الفضل دونوں آئین راہنمونی یا ارادت" یا "مریدی کا نام دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ان ناموں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے لیکن در حقیقت یہ دونوں مختلف حیثیت کے حامل ہیں اور ان کی ابتدا میں کئی سالوں کا فرق تھا۔ جس کے ذریعے اختلافات کو مٹا کر باہمی دوستی و ملاپ کی کوشش کی گئی۔ اکبر نے صلح کل" کی پالیسی بالکل شروع میں اختیار کر لی تھی جو در حقیقت ایک سیاسی اور انتظامی طریق کار تھا۔ یہ وہ تصور ہے جو فی زمانہ تکثیریت کے عنوان سے زیر بحث آتا ہے۔ نہ ہی ہم آہنگی کے باب میں اکبر صوفیانہ خیالات سے متاثر تھا، اس نے صوفیہ سے قریبی تعلق رکھے اور کثیر المذاہب مغلیہ سلطنت کو کامیابی سے مذہبی مساوات و رواداری کی راہ پر ڈالا۔ اکبر نے غیر مسلموں کو مغلیہ سلطنت میں پوری طرح سمونے کے لیے بڑی کوشش کی، راجپوتوں کی فتح اس کی بڑی مثال تھی۔ ان کا علاقہ فتح کرنے کے بعد اس نے اس وقت کے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کے مذہب کو اپنے سماج میں برابر جگہ دی۔ ان کو سر عام عبادت کی اجازت دی۔ ان کو اپنے مندروں کی مرمت کرنے اور نئے مندر تعمیر کرنے کی آزادی دی۔ جزیے کی موقوفی اکبر کی آزاد روی اور تمام شہریوں کے لیے قانونی مساوات کی حکمت عملی سے ہم آہنگ تھی۔ جزیے کی موقوفی کے نتیجے میں مساوی شہریت کے تصور نے جنم لیا جو تکثیریت کو قبول کرنے کا لازمی تقاضا ہے۔ اکبر نے ایک فرمان (محضر) جاری کیا جسے کچھ جدید مورخین نے اکبر کے حتمی

فرمان کا نام دیا ہے۔ محضر کے مقاصد بادشاہ کے امام عادل کے طور پر فقہ پر مطلق بالادستی اور اختیار کو قائم کرنا تھا۔ ان پر لازم تھا کہ وہ بادشاہ کے احکام کی اطاعت کریں۔ چناں چہ چیف قاضی، چیف مفتی اور بادشاہ کے دربار کے دیگر بڑوں نے دستاویز پر دستخط کر دیے۔ اکبر کو یہ شوق تھا کہ دنیا میں پائے جانے والے مختلف مذاہب کی تحقیق کرے اور ان کے اعتقادات و طریقہ مذاہب سے آگاہ ہو۔ لہذا اس نے دیگر مذاہب مسیحیت، جین مت، ہندومت اور سکھ مت کے لوگوں سے ان کے مذاہب کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ اکبر نے تمام غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی دی۔ اکبر نے غیر مسلموں کو حکومتی ایوانوں میں جگہ دی۔ اب اقتدار صرف ایک طبقے تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں ہندوستان کے لوگ بھی مذہبی بنیاد کی تقسیم کے تہوار اہتمام سے منائے جاتے، ان اقدامات سے پورے معاشرے میں رواداری کی فضا قائم ہوئی۔ ایک بہترین منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماہر تعمیر بھی تھے۔ ان کے دور میں تعمیرات کے کئی شاہکار بنائے گئے۔ انہوں نے آگرہ فورٹ، فتح پور سیکری کا قلعہ، بلند دروازہ اور لاہور محل بنوائے۔ اگرچہ ان کی زیادہ توجہ لوگوں کی فلاح پر تھی لیکن اس کے باوجود تعمیرات کے کئی نمونے تعمیر کرواکے انہوں نے اپنے تعمیرات کے ذوق کا ثبوت باہم فراہم کیا۔ شاید یہ ان کے ذوق کا کمال تھا کہ ان کے فرزند نے بھی دنیا کے ساتویں عجوبے تاج محل کی تعمیر کروائی تھی۔ وہ آرٹ و ثقافت کے دلدادہ تھے۔ ان کے دربار میں کئی ماہرین ہمیشہ موجود رہتے تھے جن کا تعلق ادب و فن سے تھا۔ اکبرِاعظم بذاتِ خود تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن اعلیٰ دماغ کے مالک تھے اور انسان شناس بھی۔ لہذا ہر مذہب کے فرد کو دربار تک رسائی حاصل تھی اور اُن میں سے سپاہیانہ، ذہانت، فطانت، ظرافت، علم وحکمت اور فنکارانہ صلاحیتوں کے مالک افراد اُنکے اہم درباری تھے۔ اکبر کی زندگی کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بہت اچھے شکاری تھے۔ ان کی ہمت بہادری اور دلیری نے انہیں ایک اچھا شکاری بنا دیا۔ ابتدا میں وہ شکار پر نکلتے تو اپنے ہمراہ قابل بھروسہ افراد کا جتھہ لیکر جایا کرتے تھے۔ بعد ازاں ان کے اعتماد کی انتہا تھی کہ وہ اکیلے ہی شکار پر نکلا کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے

دور حکومت میں منصب داری نظام متعارف کروایا اس کے تحت تمام علاقوں کو چھوٹے چھوٹے خطوں میں تبدیل کر کے منصب دار مقرر کر دیئے گئے تھے جو اپنے اپنے علاقے کی ترقی و خوشحالی کے علاوہ امن و امان کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی اکائیاں بہترین نظام حکومت کی بنیاد بنیں۔ مورخین کہتے ہیں کہ اکبر کے اس نظام کی جدید شکل بلدیاتی نظام ہے جسے آج کے دور جدید میں اپنایا جاتا ہے۔ اکبر نے سماجی اصلاحات کو اپنانے پر توجہ دی۔ وہ لوگوں کی زندگی کے معیار کو ہمیشہ بلند دیکھنا چاہتے تھے اس ضمن میں انہوں نے متعدد اقدامات اٹھائے جیسے بچپن میں شادی پر پابندی عائد کر دی۔ انہوں نے ستی جیسی رسومات پر بھی پابندی عائد کر دی۔ اکبر اپنی فکر، سوچ اور عمل کے اعتبار سے روشن خیال تھا۔ وہ رواداری اور مذہبی و سماجی تکثیریت پسند تھا۔

گو اکبر ایک روایتی بادشاہ تھا، اس کے طرز حکم رانی پر کئی سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں کئی خامیاں تلاش کی جا سکتی ہیں، سیاسی اور معاشی انصاف کے بارے میں اس کی ناکامیوں اور خامیوں پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ لیکن مذہبی رواداری، کثیر الثقافتی سوچ اور سب کو ساتھ شامل کر کے چلنے کی کوشش میں وہ نہ صرف سر فہرست ہے، بلکہ آج کے پاکستان اور بھارت کے حکم رانوں کے لیے تاریخ کا ایک سنہری کردار ہے۔ ہم رہ نمائی کے لیے اپنی تاریخ کے جن حکم رانوں کی طرف مڑ کر دیکھ سکتے ہیں، ان سب میں اکبر بہت نمایاں اور منفرد ہے۔ برصغیر میں مغلیہ دورِ حکومت خاص طور پر جلال الدین اکبر کے دور میں دینی اور دنیوی تعلیم کو اجاگر کیا اور شرح خواندگی آج کے دور سے کس حد تک بہتر تھی۔ انگریز دورِ حکومت میں مسلمانوں کو کس طرح نظامِ تعلیم سے دور کیا گیا۔ مدارس کے نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مدارس کے دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو شرح خواندگی میں شامل ہی نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو حکومت میں کسی بھی نوکری پر بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ جب کہ جلال الدین اکبر کے دور میں مدارس سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو اچھی منصب پر تعینات کیا جاتا تھا یعنی کہ مغلیہ دورِ حکومت میں درس نظامی والوں کو بیوروکریٹ کی حیثیت حاصل تھی۔

## علمی درجات کے اعتبار سے تقسیم افراد

ناصر الدین کے دور میں تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی، وہ ایک عالم تھا۔ انہوں نے علماء کی بڑی حوصلہ افزائی کی، اور ادبی گفتگو کرتے تھے۔ اس کے مصاحبین میں میر عبد الطیف جیسے افراد بھی شامل تھے۔ اس نے افراد کے مختلف درجات کو بارہ تیروں کے ذریعہ نامزد کیا، سب سے کم والے کو مٹی سے تشبیہ دیتا اور سب سے اوپر والے کو خالص سونے سے تشبیہ دیتا تھا۔ ہمایوں کو فلکیات اور جغرافیہ کا بہت شوق تھا، سائنس کے ان شاخوں نے اس کے دور میں کافی ترقی کی۔ ہمایوں نے سات ہال تعمیر کروائے اور ان کے نام بھی سات سیاروں کے نام پر رکھے اور ان میں علماء کو وہ زحل اور مشتری میں خوش آمدید کہا کرتا تھا۔ ہمایوں نے لوگوں کو تین درجات میں تقسیم کیا:

1. علماء، قاضی، اور دانشوروں کا پہلا درجہ ہے جن کو اہل سعادت کہا جاتا تھا۔
2. وزراء، مشیران، اور فوجیوں کو درجہ جنہیں اہل دولت کہا جاتا تھا۔
3. موسیقاروں اور فنکاروں کا درجہ جنہیں اہل مراد کہا جاتا تھا۔ (22)

اکبر کا دربار تمام مذاہب کے پیروکاروں کا اور ان سب لوگوں کو جو خود بھی نئے خیالات یا جدت پسند طبیعتیں رکھتے تھے، مرکز بن گیا۔ دوسروں کے خیالات کے ساتھ رواداری میں ہر قسم کے عقائد کی عزت افزائی میں اکبر اس قدر آگے بڑھ گیا کہ بعض وہ لوگ جو بہت متصاب قسم کے مسلمان تھے اس سے ناراض ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک نیا مذہب جاری کر دیا جو تمام مذاہب کے عقائد پر مشتمل تھا۔

## آگرہ اور لاہور بطور تعلیمی مراکز

بادشاہ جلال الدین اکبر کا دو علم و امن کا گہوارہ رہا۔ اس ماحول نے علم کی ترویج میں بہت کردار ادا کیا۔ اکبر کا دربار ہمیشہ علماء سے بھرا رہتا جیسا کہ اس کی مجلس میں ابو الفضل اس کا بھائی

فیضی، عبد القادر بدیوانی، عبد الرحیم جیسے علماء ہوتے اور آئین اکبری جیسے شاہکار کی تخلیق کا سبب بنی۔ اکبر کے دور میں تعلیم کی صورت حال کچھ یوں تھی:

آگرہ: آگرہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے:

> Agra, in the reign of Akbar, was a famous seat of learning and a celebrated centre of education. It had several schools and colleges, where students flocked from far and wide for listening to the lectures of learned and distinguished teachers. A big madrasah existed there.([23])

اکبر کے دور میں آگرہ تعلیم و تعلم کا مرکز تھا۔ یہاں پر کئی سکول و کالج موجود تھے جہاں دور دراز سے طلباء تعلیم حاصل کرتے۔ آگرہ میں ایک بہت بڑا مدرسہ موجود تھا۔

لاہور: جلال الدین اکبر کے زمانے میں لاہور کو بھی علم اور علماء کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ لاہور کے بارے میں لکھا گیا ہے:

> Lahore too was, at this time, an eminent abode of literary geniuses. It was here that celebrated Tarikh-i-Alfiwas written and the Mahabharata and the Rajtarangini were translated into Persian.([24])

اس زمانے میں لاہور کو بھی علم کی آماجگاہ تھی۔ اسی زمانے میں تاریخ الفی لکھی گئی ہے اور مہابھارت اور راجترنگینی فارسی میں ترجمہ کی گئی ہے۔

عہدِ مغلیہ کے نظامِ تعلیم کے اثرات سب سے زیادہ ہندوؤں پر ہوئے۔ اکبر سے پہلے تعلیم کا نصاب زیادہ تر اسلامی کتب پر مشتمل ہوتا تھا، ہندوؤں یا غیر مسلم کے لیے کوئی خاص نصاب نہیں ہوتا تھا۔ اکبر کے دور میں غیر مسلم نے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور حکومت میں خاص خاص عہدے حاصل کیے، اس سے پہلے ہندوؤں کی بڑی بڑی ذاتیں ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھی۔ کبر نے ہندوؤں کی چھوٹی بڑی سب ذاتوں کے لیے تعلیمی نصاب یکساں کر دیا گیا۔ ہندوؤں دیا کرن اور ویدنت پڑھایا جاتا تھا۔ مذہبی ہم آہنگی کے باب میں اکبر کا خیال تھا کہ مختلف مذاہب کو یک جا کیا

جا سکتا ہے، اس نے ایک مذہب کی دوسرے پر برتری کے تصور کے بجائے برابر کے تصور کو اپنایا۔ اکبر نے ایک خاصی بڑی جماعت ایسے لوگوں کی پیدا کر لی جنھیں اس کے ساتھ اور اس کے مقاصد کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ ان میں دو مشہور بھائی فیض (1596ء)اور ابو الفضل(1601ء)بیر بل، راجہ مان سنگھ اور عبد الرحیم خانخاناں(1625ء)تھے۔ اکبر کا دربار تمام مذاہب کے پیروکاروں کا اور ان سب لوگوں کو جو خود بھی نئے خیالات یا جدت پسند طبیعتیں رکھتے تھے، مرکز بن گیا۔ دوسروں کے خیالات کے ساتھ رواداری میں ہر قسم کے عقائد کی عزت افزائی میں اکبر اس قدر آگے بڑھ گیا کہ بعض وہ لوگ جو بہت متصاب قسم کے مسلمان تھے اس سے ناراض ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک نیا مذہب جاری کر دیا جو تمام مذاہب کے عقائد پر مشتمل تھا۔

## لائبریریوں کا قیام

بادشاہ جہانگیر عالم اور شاعر تھا۔ اس کا خاص دھیان تاریخ میں تھا، اس کے خاص مصاحبین میں نعمت اللہ، ہیبت خان، نقیب خان، مرزا غیاث بیگ، جیسے علماء شامل تھے۔ وہ فارسی اور ترکی جانتا تھا۔ جہانگیر تعلیم کی ترقی کے لیے خود بہت زیادہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے:

> He took with him a good library from Gujrat. He paid 3,000 gold coins for the purchase of rare Persianmanuscripts. He appointed Muktab Khan as the librarian of the Imperial Library and keeper of the picture gallery.The Mughal painting reached its zeneth during Jahangir. Farrukh Beg and Abul Hassan were famous painters of histime. Jahangir Namah was ornamented with paintings.([25])

> اس نے گجرات میں ایک شاندار لائبریری قائم کی، اس نے تین ہزار سونے کے سکے فارسی کی کتب خریدنے کے لیے دئے۔ اس نے مکاتب خان کو لائبریری کا انچارج لگایا۔ جہانگیر کے دوران مغل پینٹنگ اپنے عروج پر پہنچی۔ فرخ بیگ اور ابو الحسن اپنے وقت کے مشہور مصور تھے۔ جہانگیر نامہ پینٹنگز سے آراستہ تھا۔

وقت کے اہل علم مغلیہ بادشاہوں کے دربار میں ضخیم کتب کے تراجم کرتے ہوئے اور اس کے مصاحبین بنتے نظر آتے ہیں۔ اکبر ایک ذہین انسان تھا اور اس بات کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا کہ تاریخ کے اہم کارناموں کو کتب کے اوراق میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کتب خانوں کی تعمیر، شہزادوں اور شہزادیوں کی علمی تربیت اور دیگر زبانوں کے تراجم پر خصوصی توجہ دی۔ شہزادوں کی ادبی، مذہبی اور روحانی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی و جمالیاتی تعلیم کے علاوہ امور عامہ سے رابطہ کی تربیت کا خاص اہتمام کیا تھا تاکہ سلطنت کی بھاگ دوڑ سنبھال سکے اور اپنی ذمہ داریاں کو اچھے طریقہ سے نبھا سکے۔ اپنی شہزادیوں کی تعلیم پر بھی توجہ دی لیکن عوام الناس بالخصوص عام خواتین کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے زیادہ تر شاہی خاندان کی خواتین کا ذکر ہی پڑھی لکھی خواتین کے طور پر تاریخ کے اوراق میں ملتا ہے۔

## علماء میں تقسیم انعامات

بادشاہ شاہ جہاں اپنی جلالت اور ہیبت سے جانا جاتا تھا۔ اس نے امپریل کالج کی بنیاد رکھی جو کہ دلی میں جامع مسجد کے پاس تھا۔ اس دار البقاء نامی مدرسے کی دوبارہ تعمیر و توسیع کا کام کیا۔ اور وہاں قاضی صدالدین خان کو وہاں کا منیجر بھی لگایا۔ شاہ جہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے:

> "Painting received his encouragement. Shah Jahan also ordered the writing of Padshah Namah andencouraged learned men by rewards. Amin Qazwini and Abdul Hakim Slalkoti were among the most shining of his court. Architecture was a special contribution of Shah Jahan.([26])

پینٹنگ کا وہ دلدادہ تھا اور شاہ جہاں نے ہی پادشاہ نامہ لکھنے کو کہا تھا، اور وہ علماء کو انعامات دیا کرتا۔ امین قزوینی، عبدالحکیم سیالکوٹی اس کے دربار کے چمکتے ستارتے تھے۔ فن تعمیر میں شاہ جہاں کا خاصہ حصہ تھا۔

گجرات کی فتح کے دہلی کے باشندوں پر علمی لحاظ سے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ علم و فضل کے بہت سے دروازے کھلے، علماء ہجرت کر کے دہلی پہنچنے لگے۔ انہیں جلال الدین اکبر کی سرپرستی ملی۔ تعلیم صرف خانوادہ سلطنت تک محدود نہ رہی بلکہ عوام الناس بھی اس سے مستفید ہوئے۔

## علمی پروٹوکولز

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی اعلیٰ درس گاہوں میں ہزارہا طلبا سبق میں حصہ لیا کرتے تھے، بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات ایک استاد کے درس میں سیکڑوں طلبا شریک ہوتے تھے۔ وہ ملک میں علم و فن کی ترقی کا باعث بھی بنے اور اس کے نتیجے میں ملک میں بڑے بڑے ادبا، شعرا اور عالم و فاضل پیدا ہوئے اور انہیں بادشاہوں کے یہاں سے اہم مسندیں عطا کی گئیں۔ یہ تمام تعلیم کا انتظام مفت ہوتا تھا۔ غریب اور ہونہار طلبا کو قیام و طعام کے ساتھ ساتھ وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ ان مدارس میں امیر و غریب کے بچوں میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔ اساتذہ ان کی تعلیم پر ایک ہی انداز میں نگاہ رکھتے تھے۔

حکومتی سطح پر تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں بڑی بڑی جائدادیں اور جاگیریں وقف کر دی جاتی تھیں، بلکہ اس زمانے میں کتابوں کی طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا، جو تعلیم کی ترقی اور اشاعت میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ مگر ہاتھ سے کتابیں لکھنے کا رواج خوب تھا، اس کے لیے کاتب رکھے جاتے تھے۔ اس سے فن کتابت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ خوش نویسی اور خطاطی کے اس دور کے بہت سے نمونے ملک اور بیرونی ممالک کی مختلف لائبریریوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

مغلوں کا دور ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دور ہے کیونکہ فن اور اس کے میدان میں ہونے والی پیشرفت کی وجہ سے زبانیں، ثقافت اور مذہب کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ اس دور میں ہندوستانی ثقافت پر دوسرے مذاہب کے اثرات دیکھنے میں آئے ہیں۔ مغل ہندوستان میں نظام تعلیم بنیادی طور پر اسلام پر مرکوز تھا۔ نئی معاشرتی حقائق، خاص طور پر تعلیم کے جدید خطوط

پر استوار کرنے ، علمی معاشرے کے ابھرنے اور عالمگیریت کے مابین باہمی روابط نے تمام معاشروں کے تعلیمی عمل پر بہت زیادہ اثر ڈالا۔ تمام چیلنجوں اور پریشانیوں سے نمٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ، مغلوں نے تعلیم کے بین الاقوامی جہت کو بھی زیر غور رکھا۔ بین الاقوامی برادری کی قومی ضروریات اور توقعات و متضاد مفادات کا حامل معلوم ہوسکتی ہیں، لیکن مغلوں کے اندر تبدیلی کی قبولیت نے تعلیمی اصلاحات کو فروغ دیا۔

اکبر نے اپنی ہندو اور مسلم رعایا کی تعلیم کا انتظام شاہان سابق سے بہت بڑھ چڑھ کر کیا۔ قلمرو کے مکاتب و مدراس میں ہندو اور مسلم طالب علم اکٹھے پڑھتے تھے۔فارسی پڑھانے کا انداز اس قدر صحیح اور سائنٹیفک تھا۔ کہ چند ہفتوں کے اندر طالب علم فارسی نثر و نظم روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ باعتبار علوم تعلیم کی ترتیب یہ تھی ۔اخلاق،ریاضی ،حسابات ،زراعت ،ہندسہ ،ہیئت، علم الارض، معاشیات، سیاست ملکی، طبعیات، منطق، فلسفہ فطرت، مجرد ریاضیات، دینیات اور تاریخ۔ ہندو طلبہ دیا کرن(صرف و نحو) ویدانت اور پتنجلی پڑھتے تھے۔ابوالفضل لکھتا ہے کہ نظام تعلیم میں تبدیلیوں کی وجہ سے مکاتب و مدارس قلمرو کے لیے زیب و زینت کا سامان بن گئے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر اپنے دور کی انقلابی شخصیت تھی, خود ان پڑھ ہونے کے احساس نے اکبر کے دل میں علم کی جستجو کی وہ شمع روشن کی جس سے آنے والی کئی نسلوں نے جِلا پائی۔ اکبر علم و دانش کا متوالا تھا۔کم عمری میں علم کی طرف سے بے رغبتی کے باوجود اس نے جب اقتدار سنبھالا توسب سے زیادہ توجہ اسی کمزور پہلو کی طرف مرکوز کی۔دربار میں جو مطلق العنانی اور بے قاعدگی شروع ہوئی تھی ملک پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، عام ملک میں اسلامی اعتقادات برقرار رہے، بلکہ علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے، اس وقت جونپور دہلی، لاہور، سیالکوٹ، احمد آباد اور دوسرے مرکزوں میں علوم اسلامی کی اشاعت بڑی باقاعدگی سے ہورہی تھی، اور قابل علماء کی کمی نہ تھی، ظاہر ہے کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر جس زمانے میں باقی باللہ، حضرت مجدالف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث ہندوستان کی سرزمین کو اپنے چشمہ فیض سے سیراب

کریں اسے روحانی خط کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات عہدِ اکبری میں پھر استوار ہوئے، گجرات اس زمانے میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا، ایک تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ عرب سے آتے وہ پہلے یہیں قیام کرتے، اور یہاں کے لوگوں کو عرب جانے میں آسانی تھی، دوسرے شاہانِ گجرات نے علوم وفنون کی سرپرستی کر کے انہیں بہت فروغ دیا، چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عہدِ اکبری سے پہلے سو سال تک گجرات کو علم وفضل میں دہلی پر فوقیت تھی، لیکن جب اکبر نے گجرات فتح کر لیا اور دہلی کے گورنر وہاں جانے لگے اور وہاں کے لوگوں کو دہلی آنا پڑا، گجرات کے علماء دہلی پہنچنے شروع ہوئے، اور اس کا اثر یہ ہوا کہ گجرات کی بندرگاہوں کے راستے عام ہندوستانی طلبہ کو بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حصولِ علم کا موقع ملا۔

آئے دن قلمرو کے مختلف حصوں میں نئے نئے مکاتب اور بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جا رہے تھے۔ فتح پور سیکری کی پہاڑی پر اکبر نے ایک اتنا بڑا مدرسہ قائم کیا۔ کہ سیاح اس کی کوئی نظیر پیش نہ کر سکتے تھے، اس کے علاوہ شہر میں بے شمار دوسرے مدرسے بھی تھے۔ جو شہنشاہ کے حکم سے بنائے گئے تھے۔ آگرہ میں بھی بہت سے مدرسے تھے۔ جن میں تعلیم وتدریس کے لئے شیراز سے معلمین طلب کئے گئے تھے۔ کیونکہ شیراز اس زمانہ میں مسلمانوں کے علوم کا مشہور مرکز تھا۔ اکبر کے زمانہ میں فارسی وادب کا عام نصاب تھا۔ جس میں وقتاً فوقتاً جزوی تبدیلی بھی ہوتی رہی، کریما، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی، شاہنامہ، انشائے خلیفہ، بعد کے زمانہ میں اس میں وقائع نعمت خان عالی، سہ نثر ظہوری، رقعات عالم گیر، پنج رقعات اور انشائے مادھو رام بھی درس میں داخل ہوتی رہیں۔ یہ اعلیٰ مشترک تعلیم کا نصاب تھا، ابتدائی مکتبی تعلیم کا پرانا نظام بدستور قائم رہا، جس میں پنڈت اپنے پاٹھ شالوں میں اور مسلمان ملا اپنے مکتبوں میں بچوں کو ابتدائی تعلیم دیتے تھے، جن سے ہندو مسلمان طلبہ دونوں پڑھتے تھے، چنانچہ بہت سے ہندو مکتبوں اور مسلمان اساتذہ کے فیض یافتہ تھے، مسلمان فضلاء کے

اساتذہ میں بھی ہندوؤں کے نام ملتے ہیں، ان کا ذکر تاریخوں میں بکثرت ملتا ہے، اس لیے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں، آج بھی ہندو مسلمانوں کی پرانی نسلیں اس کی شاہد ہیں۔(27)

دورِ حاضر میں بھی مسلمانوں میں اسی جزبہ و خلوص کی ضرورت ہے جس کے تحت مغلیہ دور میں علم کی ترویج و اشاعت کی گئی۔ آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ حصولِ ڈگری پر کفایت کرتے ہوئے علمی میدان میں سعت پر بند بندھے گئے ہیں اور اس کی زد میں سارا معاشرہ ہی آچکا ہے نتیجۃً علوم وفنون کے وہ حقائق بھی منظر عام پر آنے سے قاصر ہوئے جاتے ہیں جن کے حصول کے لئے زندگیاں تیاغ دی گئیں۔

**خلاصہ بحث**

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں اگرچہ بادشاہوں کے یہاں بڑے بڑے علما وفضلا، منتخب روز گار اور اپنے اپنے فن میں یکتا افراد جمع رہتے تھے، لیکن عام آدمی تک تعلیم کی صورت حال اوسط ہی رہی۔ تاریخ میں عہد وسطیٰ میں کسی حکومت کا خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، محکمہ تعلیمات کا اندارج نہیں ملتا۔ لیکن ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں ایک خاص محکمہ بنایا گیا تھا، مذہبی امور اور تعلیمی اداروں کی دیکھ بھال کرنا جس کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ ایسا کوئی قابل ذکر حکمراں نہیں گزرا جس کا نام کسی نہ کسی سطح پر اس کے عہد میں کسی مدرسے یا مکتب سے وابستہ نہ رہا ہو۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی مملکت میں ملک کے طول و عرض میں بہت سے مدرسے کھولے، کتب خانے قائم کیے اور علمی خدمات کی سرپرستی کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔

عام طور پر تعلیم کے حصول کے تین ذرائع تھے۔ مکتب اور مدرسے، مساجد اور خانقاہیں اور بعض مخصوص گھرانے۔ اس زمانے میں بھی اعلیٰ تعلیم تک بہت قابل ذکر طلبا ہی پہنچ پاتے تھے، لیکن عام طور پر تعلیم کا حصول بہت مشکل نہیں تھا۔ تقریباً تمام مساجد اور خانقاہوں میں جو مدرسے قائم تھے، ان میں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا۔ مسلم عہد حکومت کی تعلیم کے معیارات کا آج کے زمانے کی تعلیمات سے موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معیار

بہت بلند تھا۔ ایک ہی شخص کئی حیثیتوں سے ممتاز ہوتا تھا۔ حالاں کہ اگر اس دور اور آج کے دور کے زمانی فرق پر غور کیا جائے اور جدید تعلیم وترقیات کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر بھی نتائج میں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ ایک سب سے بڑا جو فرق ہے وہ تربیت کا ہے، اس زمانے میں جو تربیت ہوتی تھی، آج اس کا فقدان ہے۔ اسی طرح آج تعلیم پر ہونے والی اخراجات اس دور سے کہیں زیادہ اور معیار کئی درجے کم نظر آتا ہے۔ پروموشن آف لرننگ اِن انڈیا کے مصنف این این لا لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کی اعلیٰ درس گاہوں میں ہزارہا طلبا سبق میں حصہ لیا کرتے تھے، بلکہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات ایک استاد کے درس میں سیکڑوں طلبا شریک ہوتے تھے۔ وہ ملک میں علم وفن کی ترقی کا باعث بھی بنے اور اس کے نتیجے میں ملک میں بڑے بڑے ادبا، شعرا اور عالم وفاضل پیدا ہوئے اور انہیں بادشاہوں کے یہاں سے اہم مسندیں عطا کی گئیں۔ یہ تمام تعلیم کا انتظام مفت ہوتا تھا۔ غریب اور ہونہار طلبا کو قیام وطعام کے ساتھ ساتھ وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ ان مدارس میں امیر وغریب کے بچوں میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔ اساتذہ ان کی تعلیم پر ایک ہی انداز میں نگاہ رکھتے تھے۔ حکومتی سطح پر تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں بڑی بڑی جائدادیں اور جاگیریں وقف کر دی جاتی تھیں، بلکہ اس زمانے میں کتابوں کی طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا، جو تعلیم کی ترقی اور اشاعت میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ مگر ہاتھ سے کتابیں لکھنے کا رواج خوب تھا، اس کے لیے کاتب رکھے جاتے تھے۔ اس سے فن کتابت کو بہت عروج حاصل ہوا۔ خوش نویسی اور خطاطی کے اس دور کے بہت سے نمونے ملک اور بیرونی ممالک کی مختلف لائبریریوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ المختصر عام طور پر تعلیم کے حصول کے تین ذرائع تھے۔ مکتب اور مدرسے، مساجد اور خانقاہیں اور بعض مخصوص گھرانے۔ اس زمانے میں بھی اعلیٰ تعلیم تک بہت قابل ذکر طلبا ہی پہنچ پاتے تھے، لیکن عام طور پر تعلیم کا حصول بہت مشکل نہیں تھا۔ تقریباً تمام مساجد اور خانقاہوں میں جو مدرسے قائم تھے، ان میں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا۔ مسلم عہد

حکومت کی تعلیم کے معیارات کا آج کے زمانے کی تعلیمات سے موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معیار بہت بلند تھا۔ ایک ہی شخص کئی حیثیتوں سے ممتاز ہوتا تھا۔ حالاں کہ اگر اس دور اور آج کے دور کے زمانی فرق پر غور کیا جائے اور جدید تعلیم وترقیات کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر بھی نتائج میں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آئے گا۔ ایک سب سے بڑا جو فرق ہے وہ تربیت کا ہے، اس زمانے میں جو تربیت ہوتی تھی، آج اس کا فقدان ہے۔

## تجاویز وسفارشات

اس مقالہ کے لیے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1. مغلیہ دور میں قائم کردہ لائبریریوں کی طرز پر آج بھی عوامی لائبریریاں نہایت آسان اصولوں کے تحت قائم کی جائیں جو منظم بھی ہوں اور دن رات میسر بھی ہوں۔
2. علم و فن کی قدر دانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف مقابلہ جات کے ذریعے ذہین اذہان کو کھنگھالا جائے اور ان کے مراتب کے اعتبار سے انہیں عہدوں سے نوازا جائے۔
3. ایسا نظام تعلیم متعارف کروایا جائے جو دینی وعصری تعلیم کو یکساں کفایت کرے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سادہ اور عام فہم ہو اور ترجیحاً وہ قومی زبان میں ہو۔
4. امن و تنظیم کے اعتبار سے ملک میں ایسی خوشگوار آب وہوا تشکیل دی جائے کی غیر ممالک ہجرت کے رجحانات میں کمی آسکے اور یہاں کی مٹی میں پنپنے والے قلوب و اذہان اسی ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے کوشاں رہیں۔
5. استاد معاشرے کا وہ مرکزی کردار ہے جس کی پیروی کرنا طالب علم اپنی خوش نصیبی خیال کرتے ہیں کسی بھی معاشرہ میں اساتذہ طلبہ کے لئے ایک قابل عمل نمونہ ہیں اور طلبہ ہی اخلاق و کردار اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جو وہ اپنے اساتذہ میں دیکھتے ہیں۔ اسلیے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں طے کردہ انسانی علم وثقافت کا تحفظ اور ترسیل ممکن بنائیں۔

6. چونکہ کسی بھی شخص کے افکار و نظریات کبھی بھی حرف آخر نہیں ہوتے بلکہ جیسے جیسے علم اور شعور و آگہی بڑھتا جاتا ہے افکار و نظریات میں ارتقاء کا عمل بغیر کسی تعطل کے جاری رہتا ہے بلکہ بسا اوقات پس پشت اگر شعور و آگہی کا وجود ناپید ہو تو اکثر افکار و نظریات کی حیثیت ایک فکری مغالطے سے زائد نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے اھل علم نظر کو چاہیے کہ وہ اپنے نظریات اور کچھ ایسے افکار جو کہ خود اس کی تحقیق اور فکر و نظر کا نتیجہ ہوتے ہیں انہیں حرف آخر قرار دے کر دوسروں سے ہر حال میں منوانے کی کوشش نہ کریں۔

چونکہ مغربی تہذیب، افکار و نظریات کے غالب ہونے کی وجہ سے عصر حاضر میں آج کا انسان مسلسل کئی نظریات کی ناکامی کے بعد بھٹک رہا ہے اور ارتیابی نظریات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظریہ حیات الا اللہ کا نظارہ ہے۔ اب یہ اساتذہ کے ذمہ ہے کہ وہ اس کا اعلان کس طریقہ سے کرتے اور آج کے بے چین انسان کو اطمینان اور سکون قلب کا تحفہ دیتے ہیں۔

## حوالے وحواشی

[1]. Indian Educational System: An Overview of Medieval and Modern Education. (n.d.). http://content.inflibnet.ac.in/data-server/eacharya, Retrieved November 09, 2018

[2]۔ عبد الحیئ، ہندوستان کا قدیم نصاب درس اور اس کے تغیرات، لکھنؤ، شعبہ تعمیر و ترقی، دارالعلوم، 1994، ص124

[3]۔ بختیار حسین، صدیقی، پروفیسر، مسلمانوں کی تعلیمی فکر کا ارتقاء، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1983ء، ص20

[4]۔ خورشید احمد، پروفیسر، نظام تعلیم: نظریہ روایت، مسائل انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، س۔ن، ص27

[5]۔ محمد حسین، آزاد، دربار اکبری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1991ء، ص34

[6]۔ نظام الدین، طبقات الکبری، ج2، ص 384

[7]۔ بدایونی، منتخب التواریخ، ج2، ص383

[8]۔ بدایونی، منتخب التواریخ، ج2، ص330

[9]۔ ایضاً

[10]۔ بدایونی، منتخب التواریخ، ج2، ص330

[11]۔ عبد الحیئ، ہندوستان کا قدیم نصاب درس اور اس کے تغیرات، ص125

[12]۔ عبد الحیئ، ہندوستان کا قدیم نصاب درس اور اس کے تغیرات، ص130

[13]۔ ترمذی، محمد بن عیسی، **الجامع السنن**، کتاب الاستئذان، باب في تعليم السريانية، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن، رقم الحدیث:52

[14]۔ الانفال:60

[15]۔ منور ابن صادق، تعلیم و تعلم، صادقہ پبلی کیشنز، لاہور، 1973ء، ص91

[16]۔ عزیز، ایم اے، ڈاکٹر، تعلیم اور معاشرتی تبدیلی، ص28

[17]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، **الجامع الصحیح**، کتاب العلم، باب من جعل لاهل العلم ايام معلومة، رقم الحدیث:3250

[18]۔ عبد الحئ بن العماد، **شذرات الذهب في اخبار من ذهب**، الجزء الاول، دار الفکر، بیروت، 1988ء، ص345

[19]۔ نظام الملک، خافی خان، منتخب اللباب، ص262

[20]۔ تقی الدین، ابی العباس احمد بن علی بن عبد القادر، العبیدی، المقریزی، **کتاب الخُطط**، دارالکتب العلمیہ، بیروت، س ن، ج 1، ص 64

[21]- Zaheer, S., & Jafri, H. (2012). Education and Transmission of Knowledge in Medieval India.Intellectual Discourse, 20(1), 79-102. Retrieved November 08, 2018, p.146

[22]۔ مبارک علی، اکبر کا ہندوستان، ص 173

[23]. Puri, M. (n.d.). Education in India during Vedic, Buddhist and Medieval Periods. Retrieved November09,2018,p.123

[24]. Puri, M. (n.d.). Education in India during Vedic, Buddhist and Medieval Periods. Retrieved November 09, 2018, p. 125

[25]. Zaheer, S., & Jafri, H. (2012). Education and Transmission of Knowledge in Medieval India.Intellectual Discourse, 20(1), 79-102. Retrieved November 08, 2018, p. 234

[26]. Zaheer, S., & Jafri, H. (2012). Education and Transmission of Knowledge in Medieval India.Intellectual Discourse, 20(1), 79-102. Retrieved November 08, 2018, p. 234

[27]۔ عبدالمنان ہلالی، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، معارف پریس، اعظم گڑھ (یو۔پی، انڈیا)، 2013ء، ص 251

★★★★★

# ادارہ علوم اسلامیہ کی اساتذہ محترم کی تالیفات

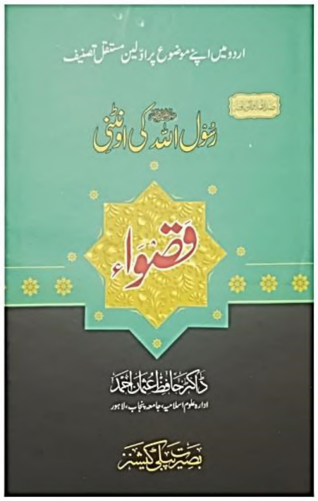


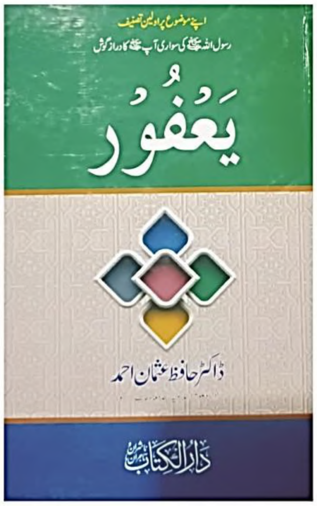


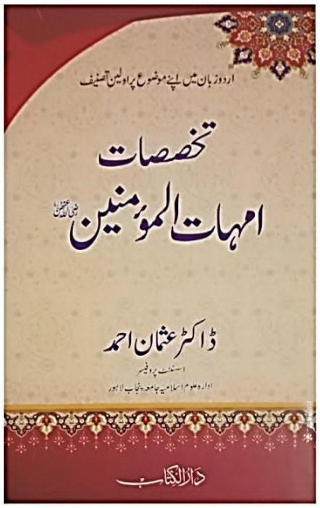

* پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر

# سرسید احمد خان
## تشکیل شخصیت کے بنیادی عناصر

حالی نے **حیات جاوید** میں سرسید کے کاموں کا اعتراف کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ جس قدر زیادہ زمانہ گزرتا جائے گا اسی قدر سرسید کے کاموں کی قدر اور ان کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی اور صدیوں تک اس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔([1]) سرسید کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔اس صدی کے دوران سرسید شناسی کا سفر دیکھیں تو حالی کے یقین کو اگلی صدیوں کی سمت پیش قدمی کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔

حالی اور دوسرے مصنفین نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے سرسید کی عظمت کے پس پردہ عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔راقم متقدمین کی آرا کا احترام کرتے ہوئے اس کے پس منظر میں جن عناصر کو کارفرما دیکھتا ہے قارئین کو ان سے آگاہ کرنے کی خواہش ان سطور کی تحریر کا باعث

* پروفیسر اردو و ڈائریکٹر ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

ہے۔ان سطور کی تحریر سے جہاں سر سید کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کی دریافت مقصود ہے وہاں اپنے سامنے بنتے بگڑتے معاشرتی دوائر میں ان اقدار کے احیا کی خواہش بھی کار فرما ہے جنھوں نے صدیوں تک عظمتوں کی تشکیل کی اور اب جو معاشرے کے لیے اجنبی ہوتی چلی جارہی ہیں۔

راقم، سر سید کی عظمت کے پس پردہ ایک انسانی مثلث کو کار فرما دیکھتا ہے۔ اس مثلث کا پہلا زاویہ سر سید کی والدہ ہیں۔ سر سید سے ایک دفعہ ان کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے:

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتی بودہ است
چون بپای خود روان گشتیم سرگردان شدیم (2)

سر سید کے والد میر متقی ایک درویش منش انسان تھے اور گھر داری سے بہت کم علاقہ رکھتے تھے ...... سر سید کی والدہ نہایت لائق، ذہین، قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں۔ **سیرت فریدیہ** کے مطابق جیسا کہ مسلمان گھرانوں کا دستور تھا کہ جن بچیوں نے مکتب کی شکل تک نہیں دیکھی ہوتی ان کی ادبی و اخلاقی تربیت اس قدر ہوتی تھی کہ وہ بھی سعدی کی **گلستان** اور **بوستان** تک پڑھی ہوتی تھیں اور اپنے بچوں کو پڑھا سکتی تھیں اور پڑھایا کرتی تھیں۔(3)

خواجہ فرید الدین کی صاحبزادی اور سر سید کی والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا۔ وہ بہ قول سر سید نہایت لائق، ذہین اور عالی دماغ تھیں۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور انھوں نے کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ سر سید کہتے ہیں؛ میں نے خود شیخ سعدی کی گلستان کے چند سبق اُن سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ وہ جب سر سید کو پڑھانے بیٹھا کرتی تھیں تو ایک لکڑی پر سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیاں تنبیہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ یہ کوڑا طالب علم کو یہ احساس دلانے کے لیے تھا کہ سبق میں کوتاہی پر سزا بھی مل سکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ انھوں نے اسے استعمال بھی کیا ہو۔ والدہ کے سرچشمہء فیضان سے سر سید نے جو کچھ پایا ذیل میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے:

## عفوودرگزر

ماں باپ اور بزرگوں کے نصائح گو وقتی طور پر گراں ہی کیوں نہ گزرتے ہوں لیکن انسان کی شخصیت پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ طبیعت اگر سلیم اور فطرت مستقیم ہو تو اولاد کے کردار میں بھی جلوہ دکھاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سرسید نے ایک شخص کے ساتھ نیکی کی لیکن موقع ملنے پر اس نے اس نیکی کا بدلہ برائی سے دیا اور سرسید کے خلاف گم نام درخواستیں دینے لگا۔ یہ صورت حال تکلیف دہ تھی، ایسے کج فطرت لوگ ہر دور میں موجود ہوتے ہیں جو نیکی کا بدلہ برائی سے دیا کرتے ہیں، اب بھی ایسے حوادث پیش آجاتے ہیں۔ حالات تو بدلتے رہتے ہیں پھر ایسا موقع آیا کہ سرسید کے ہاتھ اس شخص کے خلاف کچھ ایسے کاغذات لگے جن کی مدد سے فوجداری عدالت سے اسے کافی سزا مل سکتی تھی۔ بدلہ لینے کی طبعی انسانی جبلت نے سرسید کو اکسایا کہ اب اس بداندیش سے انتقام لینے کا اچھا وقت ہے۔ پیشتر اس سے کہ سرسید ان کاغذات کو کام میں لا کر اس احسان ناشناس کے خلاف کوئی اقدام کرتے، ان کی والدہ کو اس قضیے کی اطلاع ہوگئی۔ والدہ کی طبیعت اور ان کی روشِ تربیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سرسید سے کہا کہ ”اگر تم اس کو معاف کرو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے جو، ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف و ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو“۔ سبحان اللہ والدہ نے کس عمدگی سے دنیوی انتقام کے جذبے کی خرابی واضح کی کہ سننے والا اپنے ارادے کے نقص پر متنبہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرسید کو بھی تنبہ ہوا اور خود ان کے یہ قول ”اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہے کہ کبھی دور نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ اور جیسے میرے دل میں کسی شخص سے گو اس نے میرے ساتھ کیسے ہی دشمنی کی ہو انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہوگئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے“[4]

یہ حسنِ تربیت اور سلامتیِ طبع کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ماں کا حسنِ تربیت اور بیٹے کی سلامتیِ طبع کہ جس نے ماں کی نصیحت سے ایک قدم آگے بڑھ کر دنیوی بدلہ تو رہا ایک طرف، آخرت کے بدلے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔

## احترام آدم

عام طور سے احترام آدم کا سبق دینے اور سننے والے آدمیوں سے اپنے ہم مرتبہ لوگ مراد لے لیا کرتے ہیں۔احترام آدم یہ نہیں ہے کہ بلند حیثیتوں اور مناصب والوں کا تو احترام کیا جائے لیکن معاشرتی اعتبار سے کمزرولوگوں کو خودسے کم حیثیت سمجھتے ہوئے اس احترام کا مستحق نہ سمجھا جائے۔اسلام میں تمام بنی نوع بلالحاظِ حیثیت ونسبت بلکہ بلالحاظِ مسلک وعقیدہ لائق احترام ہیں۔ جس طرح اللہ نے اہل ثروت کے اموال میں غربا ومساکین کا حق بتایا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں بھی غربا ومساکین کے مقام کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے اسلام کے ظہور کو غرباہی سے منسوب کیا۔امرا کے بچوں میں اپنے معاشرتی مقام کے باعث الّاماشاء اللہ غربا کے لیے احترام کے اعلیٰ جذبات دیکھنے میں نہیں آتے۔ وہ انھیں خود سے کم تر مخلوق خیال کرنے لگتے ہیں۔ اس کمزوری کو اگر بچپن ہی میں بھانپ لیا جائے تو بچپن ہی میں اس کی اصلاح کی جاسکتی ہے ورنہ پندار کا سیلابِ بے اماں، احترام آدم کے جذبات کو بہالے جاتا ہے۔

سرسید کی عمر گیارہ بارہ برس کی تھی جب انھوں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور عمر رسیدہ تھا کسی بات پر تھپڑ دے مارا۔ تھوڑی دیر کے بعد والدہ کو خبر ہوگئی۔ سرسید گھر پہنچے تو والدہ نے ناراض ہو کر کہا "اسے گھر سے نکال دو جہاں اس کا دل چاہے چلا جاوے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا" چنانچہ ایک خادمہ نے سرسید کا ہاتھ پکڑا اور انھیں گھر سے باہر لے جاکر سڑک پر چھوڑ دیا۔ قریب ہی سرسید کی خالہ کا گھر بھی تھا۔ان کی ملازمہ نے یہ کیفیت دیکھی تو انھیں پکڑ کر خالہ کے گھر میں لے گئی۔ خالہ نے کہا کہ "دیکھو تمھاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور غصہ ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا اس سے بھی خفا ہوں گی۔ مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں"۔ خالہ نے یہ کہہ کر کوٹھے پر واقع کسی کمرے میں انھیں چھپا دیا۔ تین دن تک وہ اسی طرح اس کوٹھے پر چھپے رہے۔

خالہ اپنے بھانجے کے سامنے آکر نوکروں وغیرہ سے کہا کرتیں کہ "دیکھنا آپا جی یعنی میری والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔" تین دن کے بعد یہی خالہ جنھیں سرسید آپا جان کہا کرتے تھے، سرسید کا ہاتھ پکڑ کر اپنی بہن کے پاس قصور معاف کرانے کے لیے لے گئیں۔ والدہ نے معاف کرنے کی بجائے یہ کہا کہ جس نوکر کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اس سے معافی مانگے اگر اس نے معاف کر دیا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ چنانچہ "مجرم" کو اس نوکر کے پاس لے جایا گیا۔ سرسید نے اس کے آگے ہاتھ ہاتھ جوڑے تب کہیں جا کر ان کی تقصیر معاف ہوئی ۵۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔

## غربا کی خبر گیری

والدۂ سرسید کی خاص عادتوں میں سے ایک یہ امر تھا کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں۔ زنانہ مکان کے باہر بطور جلوخانہ کے ایک میدان تھا اور اس کے ایک طرف متعدد کوٹھریاں اور یک درے ملازموں کے رہنے کے لیے بنے ہوئے تھے۔ غیر اور لاوارث بڑھیا عورتوں کو اس میں رکھتی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک لاوارث بڑھیا مسماۃ زیبا تھی۔ سرسید بتاتے ہیں کہ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زیبا بھی بیمار ہوئی، بیماری بھی قریب قریب ایک ہی تھی۔ جو دوا والدہ صاحبہ کے لیے تیار ہوتی تھی اسی میں سے زیبا کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی۔ مگر حکیم صاحب نے سرسید کی والدہ کے لیے ایک نسخہ معجون کا تجویز کیا۔ اس معجون کے اجزا بہت مہنگے تھے۔ اب تو جدید قارئین معجونوں اور ان کے اجزا سے کم ہی واقف ہوں گے لیکن پرانے لوگ اکثر بیماریوں میں اطبا کے تجویز کردہ ایسے معجون استعمال کیا کرتے تھے۔ ان قیمتی اجزا پر مشتمل جس قدر معجون تیار ہوا وہ مقدار میں ایک ہی شخص کے لیے چند روز تک کفایت کر سکتا تھا۔ سرسید اس زمانے میں دلی میں منصف تھے۔ وہ اپنی والدہ کے لیے یہ معجون تیار کروا کر لے گئے اور بتایا کہ یہ اتنے روز تک کفایت کرے گا۔ والدہ نے یہ گراں قیمت معجون لے لیا، اتفاق سے یہی معجون زیبا کے لیے بھی مفید تھا لیکن سوال یہ تھا غریب زیبا کے لیے کون ایسا مہنگا معجون بنوا کر لائے گا چنانچہ والدۂ محترمہ نے اس معجون کو خود استعمال کرنے کے بجائے خاموشی سے زیبا کو کھلانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی۔

ان کے حسنِ نیت کا نتیجہ تھا کہ خود ان کی صحت معجون کھائے بغیر ہی ترقی کرنے لگی۔ چند روز بعد سر سید نے والدہ سے کہا کہ اس معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا "تمھارے نزدیک بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دیتا"۔(5) سر سید اس جواب پر متعجب ہوئے۔ تب والدہ نے بتایا کہ وہ معجون خود کھانے کی بجائے غریب زیبا کو کھلاتی رہیں کہ اس غریب کے لیے یہ مہنگا معجون کون بنوا کر لائے گا نتیجتاً خدا نے دونو کو صحت عطا فرمادی۔(6) ایک کو دوا کے ذریعے اور دوسرے کو حسن عطا کے ذریعے۔

## خیرات اور اس کے مصارف

آج کل بہت بھی احتیاط کی جائے تو لوگ سال کے بعد ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکال دیتے ہیں اور اس کی ادائی بھی تعطل و تاخیر کا شکار رہتی ہے لیکن یہ احساس بہت کم پایا جاتا ہے کہ قرآن کی رو سے مرفہ الحال لوگوں کے مال میں غربا یعنی سائلوں اور محروموں کا حصہ ہوتا ہے۔ کسی کو اس کا حق دینا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا۔ کمال تو یہ ہے کہ سائلوں اور محروموں کو ان کے حق سے بڑھ کر دیا جائے۔ والدۂ سر سید گھر کی کل آمدن کا حساب کر کے اس کا پانچ فی صد خدا کے نام پر علیحدہ کر دیا کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنی بہنوں اور بھانجیوں کو بھی تاکید کر رکھی تھی کہ اسی طرح پانچ فی صدی کے حساب سے خدا کی راہ میں دیا کریں۔

اس طرح للہ فی اللہ خرچ کے لیے ان کے پاس ایک معقول سرمایہ جمع ہو جاتا تھا اور وہ اس طریقے سے جمع ہونے والی رقم کو نہایت عمدگی اور خوبی اور ایک انتظام سے خیرات میں صرف کیا کرتی تھیں۔ اُس میں سے کچھ تو غریب پردہ نشین عورتوں کی امداد پر جو معاش سے تنگ ہوتیں، صرف کرتیں۔ کچھ غریب عورتوں کی جوان لڑکیوں کے نکاح کے لیے مختص کر دیا کرتیں، جس کے نتیجے میں ان کی توجہ سے بہت سی جوان لڑکیوں کا نکاح ہوا۔ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نوکری پیشہ یا غریب اور مفلس خاندانوں کی بیوہ ہو جانے والی جوان لڑکیوں کے عقد ثانی کی نصیحت کیا کرتیں اور اس مقصد کے لیے روپے پیسے سے ان کی ہر ممکن امداد کیا کرتیں۔ وہ عموماً لوگوں کو سمجھاتیں کہ نکاح ثانی نہ کرنا دوسری چیز ہے مگر نکاحِ ثانی کو معیوب سمجھنا یا جس نے نکاح ثانی کیا ہے اس کو حقیر و ذلیل سمجھنا سخت گناہ ہے۔(7)

## صلہ رحمی

عام معاشرتی مصروفیات میں اپنے قریبی لوگوں سے ملنا جلنا ہی کم ہو کر رہ گیا ہے کجا وہ اعزہ و اقارب جو اپنی غربت کے باعث معاشرے میں کسی خاص مقام کے حامل نہ ہو سکے ہوں۔ دیکھا جائے تو ہماری مصروفیات صرف ذاتی زندگی اور اس کے مفاد کے گرد ہی گھومتی ہیں۔ سرسید کی والدہ کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ اپنے غریب رشتہ داروں کے گھر میں جایا کرتی تھیں، ان جیسی اونچے گھرانے کی خاتون کا غریب رشتے داروں سے ملنے چلے جانا ہی کم نہیں تھا اس پر مستزاد یہ کہ وہ ان کی خفیہ طور پر کسی حیلہ سے امداد بھی کیا کرتیں۔ بعض رشتہ دار ایسے بھی تھے کہ انھوں نے ایسی عورتوں سے شادی کر لی تھی جن سے ملنا جلنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ **الخلق عیال ا للہ** کے تصور کے مطابق ایسے رشتہ داروں سے بھی میل جول رکھتی تھیں۔ ان کا قول تھا کہ خدا کے حکم سے صلہ رحم سب پر مقدم ہے۔ وہ خود اُن کے گھر جاتیں اور ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرتیں۔(8)

## توکل علی اللہ

گزشتہ سطور میں ایک غریب عورت زیبا کی بیماری کے دوران اپنے علاج کے لیے تیار کروایا گیا معجون اسے کھلا دینے کا ذکر ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھیں ہر بات میں خدا پر بہت توکل تھا۔ وہ یہ کہا کرتی تھیں کہ ”دکھ بیماری میں علاج کرنا۔ دوا دینا صرف ایک حیلہ ہے۔ شفا دینے والا خدا ہے۔ اگر دوا اور حکیموں کے علاج سے لوگ مرا نہ کرتے تو سب لوگ خدا کو بھول جاتے“ وہ کہتی تھیں کہ ”اگر سیتلا کے پوجنے سے لڑکیاں لڑکے سیتلا کی بیماری سے نہ مرتے تو تمام دنیا بجز ان کے جن کو خدا بچاتا کافر ہو جاتی۔“(9) سیتلا چیچک کی بیماری نیز چیچک کی دیوی کا نام تھا جسے اس مرض سے نجات کے لیے پوجا جاتا تھا۔ میر تقی میر کا شعر ہے:

جب نہ تب پنڈے پر لیے پائے
سیتلا کے سے دانے مرجھائے (10)

جس دوراور معاشرے سے ان کا تعلق تھااس میں توہم پرستی عام تھی۔سیاسی اقتدار چھن جانے سے معاشرے میں جومایوسی اور کم ہمتی پیداہوجایاکرتی ہے اس کا اثرعقائد پر بھی پڑتا ہے۔ لوگ توحیدِ خالص کو فراموش کر کے بلاارادہ بھی غیر اللہ کی جانب متوجہ ہوجایاکرتے ہیں اور اس باب میں خواتین کے ہاں کچھ زیادہ ہی تقدم دکھائی دیتا ہے لیکن سرسید کی والدہ؛ منت، نذر، نیاز وغیرہ کی قائل نہیں تھی۔ وہ کبھی اس جانب متوجہ نہیں ہوئیں۔ تعویذ گنڈے اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن یہ بھی تھا کہ اگر کوئی ایسا کرتا تو اسے منع بھی نہیں کرتی تھیں ان کا خیال تھا کہ 'اگر ایسے لوگوں کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہ امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ گنڈہ تعویذ کرتے ہیں یا سعادت و نحوست دیکھتے ہیں تو ان کے ایمان میں زیادہ خلل آئے گا اور وہ یقین کریں گے کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اور اگر ایسا کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا'۔ ان کا قول تھا کہ "ہر بات کے لیے صرف خدا سے دعا کی جانی چاہیے پھر وہ جو چاہے گا کرے گا" وہ یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ "مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں اُس میں بھی خدا کی کچھ حکمت ہوتی ہے۔ مگر بندے اُس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔" (11)

سرسید کے بہ قول ان کے ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی مگر سرسید کی والدہ شاہ غلام علی صاحب دہلوی (۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء...... ۲۲/ صفر ۱۲۴۰ھ / ۱۶/ اکتوبر ۱۸۲۴ء) سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتی تھیں۔ شاہ صاحب نقشبند ثانی کہلاتے اور حضرت میرزا مظہر جان جاناں سے بیعت تھے اور بہ قول سرسید اپنے پیر پر فوقیت لے گئے تھے۔ سرسید نے **آثارالصنادید** میں بڑی تفصیل سے ان کا ترجمہ اور اپنے خاندان کے ساتھ ان کے تعلق کا حال لکھا ہے۔ سرسید کہتے ہیں کہ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے ...... خانقاہ میں پانسو سے کم فقیر نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا اللہ تعالیٰ غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا۔ اس عالم میں ایک مرتبہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خان والی ٹونک نے چاہا کہ ان کی خانقاہ کے لیے کوئی وظیفہ مقرر کر دیا جائے اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ شعر لکھ بھیجا:

ما آبروی فقر و قناعت نمی بریم
بامیر خان بگوی کہ روزی مقرر است (12)

جس شیخ کے توکل کا یہ عالم ہو اس کے مریدوں میں بھی اس کی صفات منعکس ہوتی ہوں گی۔ شاہ غلام علی صاحب، غیر اللہ کے خیال سے بھی دور تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی ان کے پاس کوئی حاجت لے جاتا تو وہ اسی وقت ہاتھ اٹھاتے اور سب حاضرین سے کہتے کہ ”دعا کرو کہ خدا اس کی آرزو پوری کرے۔“ سرسید کی والدہ بھی اسی عقیدے پر استحکام رکھتی تھیں۔ سرسید کی بسم اللہ شاہ غلام علی صاحب ہی نے فرمائی تھی۔ سہ پہر کے وقت بہت سے مہمان جمع تھے جب سرسید کو شاہ غلام علی صاحب کے سامنے لا کر بٹھایا گیا اور انھوں نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم مگر سرسید ان کی طرف دیکھتے رہے اور منہ سے کچھ نہ بولے اس پر شاہ صاحب نے اٹھا کر انھیں اپنی گود میں بٹھالیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر سورۂ علق کی ابتدائی آیات **مالم یعلم** تک پڑھیں اب سرسید نے بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھا بعد کے زمانے میں اس واقعے کی یاد میں سرسید نے یہ شعر کہا تھا:

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
ز فیض نقشبند وقت و جان جان جانانی (13)

سرسید کی ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے۔ اس زمانے کے بعض توہمات ان کے خاندان میں بھی رواج رکھتے تھے۔ خاندان کے بعض بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک گنڈہ دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا بارہ برس کی عمر تک اسے انڈا یا مرغی کھانے سے روک دیا جاتا تھا۔

سرسید کے بیٹوں سید حامد اور سید محمود کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈہ پہنایا۔ مگر سرسید کی والدہ ایسے خیالات سے اتفاق نہ رکھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ اس گنڈہ کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھایا جائے تو کوئی آفت آئے گی، خدا پر ایمان رکھنے کے خلاف ہے۔ وہ ان دونوں بچوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود

ہوتی جس میں انڈا ملا ہوتا یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔ ان بچوں کو پراٹھے اور انڈے پسند تھے۔ والدہ بے تامل ان کو وہ پکوا کر کھلا دیتی تھیں۔(14)

## بدلتے دنوں کا لحاظ

سرسید کہتے ہیں میں جب دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھے نصیحت کرتی تھیں کہ "جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو۔ کبھی پیادہ پا۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اُس کو نباہ سکو"(15) چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا کہ اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔

دوسروں کو عمل خیر اور صبر وقناعت کی نصیحت کرنا جتنا آسان ہوتا ہے اس پر خود عامل ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ عام طور سے افتادو پریشانی کے لمحوں میں ناصحین کے ہاتھ سے بھی صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ کم لوگ ہوتے ہیں جو غم واندوہ کی حالت میں بھی شیوۂ صبر وقناعت پر عامل رہیں۔ سرسید کے بڑے بھائی یعنی سید محمد خاں جو ان کے بڑے بیٹے تھے، سینتیس اڑتیس برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ فطری طور پر ماں کو بیٹے سے جو محبت ہوتی ہے اس کے اقتضا سے وہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ مہینہ بھر کی علالت کے بعد وہ راہی ملک عدم ہو گئے۔ ایسے مواقع پر جیسا کہ ہوا کرتا ہے سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ ایسے موقع پر ماں کو جو رنج و غم و ہوا ہو گا اس سے کون انکار کر سکتا ہے بہ قول سرسید "بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے۔ لیکن اسی حالت میں انھوں نے کہا کہ: خدا کی مرضی اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور اشراق تک مصلے پر سے نہیں اُٹھیں"۔(16)

یہ تو بیٹے کے انتقال کے وقت کی کیفیت تھی۔ سرسید بتاتے ہیں کہ اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک لڑکی کی شادی اُسی زمانہ میں قرار پا چکی تھی اور صرف چار دن شادی کے باقی رہے تھے۔ اور وہ تمام سامان شادی کا تیار کر چکی تھیں کہ سید محمد خاں کا انتقال ہو گیا اور جیسا کہ دستور ہے اُن لوگوں نے اس لڑکی کی شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تیسرے دن اپنے بڑے بیٹے کے انتقال کے اور ایسے سخت صدمہ کی حالت میں خود اُن رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ "میں

تمھاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہو گا اور جو امر کہ خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم ہر گز شادی کو ملتوی مت کرو اور جب کہ میں خود تمہارے گھر میں آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔(17)

## قطع تعلق سے گریز

رسول خداؐ نے ایک طویل حدیث میں اپنی بعثت کے جو مقاصد بیان فرمائے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں۔ ایک مقام پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: **لایدخل الجنة قاطع۔** قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہو گا(18) امام نووی نے اس حدیث کی دو تاویلیں بیان کی ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد وہ انسان ہے جو قطع رحمی کی حرمت کا علم ہونے کے باوجود بغیر کسی سبب اور شبہ کے رشتہ توڑنے کو حلال جانتا ہے ایسا شخص جنت میں کبھی داخل نہیں ہو گا دوسری تاویل یہ ہے کہ اس ے مراد وہ انسان ہے جو جنت میں پہلے جانے والوں کے ساتھ نہیں جائے گا بلکہ جس تاخیر کا اللہ نے ارادہ کیا اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔

ہماری پرانی تہذیب پر اس ارشاد گرامی کا بڑا گہرا اثر رہا ہے۔ سرسید کی والدہ کے ہاں بھی اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے۔ سرسید بھی حکیم نجف خان کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے **آثارالصنادید** میں حکمائے کرام ذوالمجد والاحترام کے ذیل میں ان کا بڑا زوردار تعارف لکھا ہے۔ سرسید نے بتایا ہے کہ انھیں بہادر شاہ ظفر نے عزالدولہ کا خطاب دیا اور انگریزوں کی آمد کے بعد کمپنی بہادر نے بھی عہدۂ طبابت پر واسطے معالجہء مرضا کے مامور رکھا، ان کے اوصافِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ حیز تحریر سے خارج ہیں۔ ”جی چاہتا ہے کہ ان کے محامد و مناقب کو جہاں تک زمانہ مساعد ہو بیان کیے جاؤں لیکن قلم شکستہ زباں کو طاقت نہیں کہ اس کا عشر عشیر بھی لکھ سکے“(19) سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب سرسید دہلی میں منصف ہو کر آئے تو اپنے مرحوم بھائی کی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے میل ملاقات جاری رکھی۔ ہفتہ میں دو روز ان کے پاس جایا کرتے اور وہ بھی وقت معین پر سرسید سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک بار ایسا

ہوا کہ حکیم غلام نجف صاحب کسی بات پر ناراض ہو گئے لیکن سرسید بدستور ان کے پاس جاتے رہے مگر انھوں نے آنا چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک سرسید کا یہ معمول جاری رہا لیکن بالآخر جیسا کہ ہوتا ہے سرسید کے معمول میں بھی فرق واقع ہو گیا اور انھوں نے بھی حکیم صاحب کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ سرسید کی والدہ نے یہ صورت دیکھی تو سرسید سے کہا کہ "میں سمجھتی ہوں کہ تم اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو اس کا کیا سبب ہے۔" سرسید نے حقیقت حال بیان کر دی۔ اُنھوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جہاں دوستی ہے اس کا پورا کرنا چاہیے۔ یہ تمھارا فرض ہے اور اُس دوست کو دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے کیوں ذمہ دار ہوتے ہو۔ تم کو بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔"[20]

## بدلے کا تصور

عام معاشرتی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اچھے بھلے لوگ بھی اچھائی کا بدلہ اچھائی سے تو دے دیتے ہیں لیکن جہاں دوسرے کی جانب سے کوتاہی ہوئی وہ فوراً اس کی اچھائی کو فراموش کر کے عوض معاوضہ کے اصول پر آ جاتے ہیں، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ماضی میں جس شخص نے ہمارے ساتھ نیکی کی اس کا اقتضا کیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے اچھے روابط بھی کاروبار کی طرح ہو جاتے ہیں اور عفو و درگزر کی اعلیٰ اقدار بروئے کار نہیں آپاتیں۔ سرسید کی والدہ انھیں نصیحت کیا کرتی تھیں کہ "اگر کسی نے ایک دفعہ تمھارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے۔ یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی برائی برابر ہو گئی۔ مگر نیکی ایسی چیز ہے کہ اُس کے بعد نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اُس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا"۔[21]

سرسید کی والدہ کے یہ تصورات درست دینی عقائد کی بنا پر قائم تھے۔ گو سرسید کے عقائد میں بعد ازاں انحرافات بھی در آئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کی تربیت کا بنیادی گہوارہ انحرافات و بدعات سے پاک تھا۔ ان کی والدہ کے خیالات اپنے آبا کے زیر اثر الا ماشاء اللہ محققانہ

اصولوں پر استوار تھے۔ سر سید جو بعد ازاں بزعم خویش مقام تجدید پر فائز ہو گئے اپنی والدہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ، جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادتِ بدنی یعنی قرآن مجید پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دے کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا قائل نہیں ہوں اور عبادت مالی میں بھی ]بجز[ اُس صورت کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جاوے نیابت کا قائل نہیں ہوں۔ تعجب ہے کہ میرا عقیدہ اس زمانہ کے وہابیوں یا اہل حدیث سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ گو وہ عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں مختلف ہیں مگر ہر حالت میں عبادت مالی کے ثواب پہنچنے میں سب کو اتفاق ہے۔“[22]

اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق، دانشمند اور دوراندیش، فرشتہ صفت بی بی تھیں اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر جس کی اس نے تربیت کی ہو، کیا اثر پڑتا ہے۔

## نانا

سر سید کی شخصیت کی تشکیل میں دوسرا بنیادی کردار ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد کا تھا۔ دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد مغلیہ درباروں میں مناصبِ عالیہ پر فائز رہے۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں وزیر اعظم تھے۔ بعد ازاں اس منصب سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی انتظامی قابلیت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب پنجاب میں مغل حکومت ختم ہو گئی اور سکھا شاہی کا دور دورہ ہوا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انھیں اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا اور اس مقصد کے لیے اپنے معتمد کے ذریعے تیس ہزار روپیہ بہ طور سفر خرچ دبیر الدولہ کے پاس بھیجا اور انھیں لاہور بلایا۔ توقع تھی کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لیں گے عمومی طور پر ان کے متعلقین بھی یہی چاہتے ہوں گے لیکن ان کی بڑی بیٹی یعنی سر سید کی والدہ نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ خواجہ فرید الدین احمد کی تین

بیٹیاں تھیں؛ عزیزالنسابیگم والدۂ سرسید، فاطمہ بیگم اور فخر النسابیگم۔عزیزالنسابیگم نے کہا کہ خدانے آپ کو اس قدر دیاہے کہ جس طرح پر چاہیں آپ آرام کرسکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ زیادہ بھی مل جائے تو بھی جو آرام وآسائش آپ کو اب ہے اس میں کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا۔والدۂ سرسید جو بڑی صائب الرائے تھیں، ان کا خیال تھا کہ والد کالاہور جاکر رہنااور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات قبول کرنا اور باقی گھرانے کا انگریزوں کی عمل داری میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آئیں اور کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آجائیں اس لیے اس پیش کش کو قبول کرنا مناسب نہیں۔انھوں نے والد سے کہا کہ اس زمانہء ضعیفی میں کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے، وہاں جانامیں پسند نہیں کرتی۔ سرسید کے ناناکے دل پر بیٹی کی اس بات نے ایسااثر کیا کہ انھوں نے رنجیت سنگھ کی یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کردیااور سفر خرچ واپس بھیج دیا۔ایک بار پھر یہ تحریک ہوئی([23]) لیکن ایک بار کے انکار پر عمر بھر قائم رہے اور پھر کسی دربار سے تعلق اختیار نہیں کیا۔یہاں مرزا رفیع سودا کو نواب شجاع الدولہ کا "برادرِ من اور مشفقِ من" کہہ کر اپنے دربار سے وابستگی کے لیے بلانا اور مرزاسودا کا بہ طور معذرت ایک رباعی لکھ بھیجنا یاد آتاہے۔سودانے اس دعوت کے جواب میں جو رباعی لکھی وہ دیکھ لیجیے:

سوداپے دنیاتو بہ ہر سو کب تک　　آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل نہ یہی اس سے کہ تادنیاہو　　بالفرض ہوایوں بھی تو پھر تو کب تک([24])

ان کی شخصیت کے مرتب و منظم ہونے کااندازہ اس بات سے بھی کیاجاسکتاہے کہ وہ باقاعدگی سے روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ سرسید کی روایت ہے کہ عہد شباب سے، ان کے انتقال سے دوہفتے پیشتر تک ان کا لکھاہوا روزنامہ ان کے گھرانے میں موجود تھا اور سرسیدنے اسے بہ طورایک دلچسپ تاریخ کے بارہا پڑھالیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جہاں اور بہت کچھ تباہ و برباد ہو گیا وہاں یہ روزنامچہ بھی ضائع ہو گیا۔([25]) اب ہم اس روزنامچے کا ذکر صرف سرسید کی سیرت فریدیہ ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔خواجہ فریدالدین ۵۷ء کی جنگ آزادی سے پینتیس سال قبل ۱۴/ محرم ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء کو اس دنیاسے رخصت ہوچکے تھے۔ وہ بیرون ترکمان

دروازہ چونسٹھ کھمبہ میں دفن کیے گئے، مزار پر بسنت چڑھتی رہی، میلہ ہوتا رہا۔ ان کے چھوٹے بیٹے اور سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خان نے ''جابہ بہشت یافتم'' مادۂ تاریخ نکالا۔ سرسید، جب حالی کے لیے اپنے خاندان کے حالات لکھ رہے تھے تو انھوں نے مولانا حالی سے اس مادۂ تاریخ کا ذکر کیا۔ حالی نے اس مادے کو منظوم کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۵/اگست ۱۸۹۳ء کا ہے جس سے سیرت فریدیہ کے زمانہ تصنیف کا بھی علم ہو جاتا ہے اور بڑی وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید مرحوم ۲۵/اگست ۱۸۹۳ء کو یہ رسالہ لکھ رہے تھے۔

رخت سفر چو از جہان خواجہ فریددین بہ بست
از پی سال رحلتش سوی بسو شتافتم
روی نمود ناگہان خواجہ شبی بہ خواب در
دیدو بخندہ بازگفت 'جابہ بہشت یافتم' (26)

## کتاب دوستی

سرسید کے نانا باوجودیکہ عمر بھر سیاسی مناصب پر فائز رہے درباری زندگی کی اونچ نیچ دیکھی لیکن اس کے ساتھ انھیں علم و ادب کا ذوق بھی تھا۔ کتابوں سے شغف رکھتے تھے ایک بڑا کتب خانہ فراہم کر رکھا تھا اور اس کتاب خانے کی کم و بیش ہر کتاب ان کی نظر سے گزری ہوئی تھی۔ دستور یہ تھا کہ ہر نئی کتاب مطالعہ کے بعد کتب خانے میں داخل کی جاتی تھی اور کتب خانے کی کتابوں کے ان کی نظر سے گزرنے کا ثبوت کتابوں کے وہ حواشی تھے جو ان کے قلم سے ہر کتاب پر موجود پائے جاتے تھے۔ وہ خود بھی ایک مصنف تھے جنھوں نے علم ہیئت اور آلات رصد، صنعت اصطرلاب، صنعت پرکار متناسبہ، اعمال پرکار متناسبہ پر کتابچے تصنیف کیے جو سرسید کی نگاہ سے بھی گزرے۔ سیرت فریدیہ کی تالیف کے وقت سرسید نے لکھا کہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رسالہ مسمی بہ تحفہ نعمانیہ صنعت اصطرلاب میں ہمارے پاس موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ کو کلکتے میں تھے..... تمت الرسالہ جمادی الثانی ۱۲۳۱ھ در کلکتہ۔ (27)

اوپر مذکور تصانیف میں سے آخر الذکر تین کو تو سرسید نے اس دعا کے ساتھ کتب خانہ مدرستہ العلوم میں داخل کیا ''خدا کرے صدہا سال تک اس کتب خانے میں محفوظ رہیں'' عربی فارسی تو

خیر اس عہد کی لازمی علمی زبانیں تھیں ان کے کتب خانے میں انگریزی کتب کی موجودگی اور ان کے حواشی پر بعض لغات کے معانی کا اندراج اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ وہ انگریزی سے بھی واقف تھے تھے۔ سرسید کا خیال یہ ہے کہ "ان کو کسی نہ کسی قدر انگریزی آتی تھی کم سے کم یہ کہ بول لیتے اور پڑھ لیتے تھے"(28)(ص۲۶)

## نفاست

وہ معاشرے کے طبقہ امرا سے تعلق رکھتے تھے اس لیے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت ان کی شخصیت کا لازمی حصہ رہے ہوں گے۔ رؤسا، امرا، شرفا ان کا نہایت ادب واعزاز کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں نفاست بہت تھی۔ لباس نہایت اجلا، فرش اور گردوپیش کی اشیا بھی لباس کی طرح نفیس اور اجلی۔ باوجود وزارت و امارت کے تعلیم و تعلم سے شغف تھا یا ہوسکتا ہے کہ سرسید نے چونکہ آخری زمانے میں انھیں دیکھا اس زمانے میں یہ شوق ترقی کر گیا ہو۔ بہ قول سرسید ان کا معمول تھا کہ دو تین طالب علموں کو سبق پڑھایا کرتے تھے متعدد طالب علموں میں سے دو تین ذہین طالب علموں کو منتخب کر لیتے تھے اور اگر کوئی امداد کا مستحق ہوتا تو اس کا وظیفہ بھی مقرر کر دیتے تھے۔ وقت کے بڑے بڑے نام وروں کو ان کے تلامذہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔(29)

## آداب مجلس

ان کی محفل بھی ان کی شخصیت کی طرح نہایت شائستہ اور مہذب ہوا کرتی تھی جس میں شریک ہونے والوں کو ایک عظمت اور شان کا احساس ہوتا تھا۔ تمام لوگ نہایت ادب اور شائستگی سے خاموش بیٹھے ہوا کرتے تھے کوئی فضول بات بجز کام کی باتوں کے یا کسی علمی مسئلے کے اور بعض دفعہ تصوف کے مسائل کے اور کچھ ذکر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ باتونی، ظریف اور محفل آرا قسم کے شرکا بھی اس محفل میں آکر چپکے بیٹھ رہتے تھے۔

**آداب طعام**

سر سید کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق ان کے نانا صبح کا کھانا محل سرا میں جا کر کھایا کرتے تھے۔ ایک بہت بڑے نعمت خانے میں بہت وسیع دستر خوان بچھا ہوا ہوتا تھا اور سب بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، بیٹوں کی بیویاں اور چھوٹے بڑے سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کی پیش کش کا طریقہ یہ تھا کہ چھوٹے بچوں کے سامنے خالی رکابیاں (پلیٹیں) رکھ دی جاتی تھیں۔ وہ ہر ایک سے اس کی پسند پوچھتے اور پھر وہ شے چمچ کی مدد سے بدستِ خود اس کی رکابی میں ڈالتے۔ اس طریقے سے چیزوں کو لینے اور مناسب مقدار میں ڈالنے کا سلیقہ سکھایا جاتا پھر اس میں میزبان کی حیثیت سے شرکائے طعام کی خدمت کا پہلو بھی بچوں کے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ اس طرح تمام بچے نہایت ادب و صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ ادب آداب کے اہتمام میں اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ کوئی شے گرنے نہ پائے، کھانے میں زیادہ ہاتھ نہ بھریں، کھانا کھاتے ہوئے کھانے کی آواز نہ آئے وغیرہ۔(30) یوں گویا وہ بچوں کو عملی طور پر کھانے کے آداب سکھایا کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے **سیرت فریدیہ** کے مطالعے کے دوران مندرجہ بالا عبارت پر حاشیہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ نعمت خانہ سے مقصود ایک طرح کی مسہری ہے جو دستر خوان کے چاروطرف لگ جاتی تھی تاکہ مکھی کا گزر نہ ہو۔ والد مرحوم (مولانا آزاد کے والد مراد ہیں) نے مکہ معظمہ میں بنوائی تھی اور دن کا کھانا ہمیشہ اسی کے اندر کھاتے تھے۔ اسی طرح کھانے کے دوران سر سید کے نانا دبیر الدولہ کی نگرانی کے حوالے سے عبارت کے گرد مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ کھانے میں انگلیوں کے صرف سرے آلودہ ہونے چاہئیں پلاؤ چاول کے کھانے میں بھی یہ احتیاط ضروری تھی کہ لقمہ انگلیوں کے اندر رہے اس سے زیادہ مقدار نہ ہو۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میری انگلیاں سالن سے آلودہ ہو گئی تھیں اس پر والد مرحوم اس قدر برآشفتہ ہوئے کہ قریب تھا تھپڑ مار دیں۔ رقیق چیز کے پینے اور نوالہ کے چبانے کی آواز نکلنا حد درجہ معیوب سمجھا جاتا تھا اور غیر محتاط دستر خوان پر بیٹھنے کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا۔(31) مولانا آزاد کی اس حاشیہ آرائی سے ہمارے تمدن کی نفاست اور بزرگوں کے اندازِ تربیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

## انداز تدریس

شرفا کے ہاں دستور تھا کہ خاندان کے بڑے بوڑھے بچوں کو خود پڑھایا کرتے تھے۔ کم سنی میں بچوں کو مکتب میں بھیجنا مناسب خیال نہیں کیا جاتا تھا جو بچے مکتب جانا شروع کر دیتے تھے ان کی تعلیمی رفتار سے بھی بڑے آگاہ رہتے اور گھر پر ان کا سبق سنا جاتا تھا۔ سرسید کے گھرانے میں بھی یہی دستور تھا۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد پوتے، نواسے، نانا کو سبق سنانے جاتے ان کی مسند کے آگے ہاتھی دانت کے بنے ہوئی فانوس 'مردنگیں' میں شمع جل رہی ہوتی تھی اور ان کے سامنے لڑکے بیٹھتے۔ نہایت سفید چاندنی کا فرش ہوتا تھا جس کی خاطر بچے اپنے پاؤں بہت صاف رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی بچے کے پاؤں کا دھبہ چاندنی پر لگ جاتا تو نہایت خفگی سے اسے بھگا دیتے کہ کتے کے سے پاؤں کیوں رکھتا ہے۔ اس بات کا ابھی اہتمام تھا کہ کپڑے پر کسی قسم کا دھبہ یا روشنائی گری ہوئی نہ ہو اور اگر کوئی بچہ خاص اس وقت کے لیے یہ اہتمام لباس تبدیل کر کے آتا تو اسے بھی پسند نہیں کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "کیا تو چماروں کے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا کہ بدل کر آیا ہے" مراد یہ تھی کہ لباس کو تو ہر وقت صاف ہونا چاہیے۔

سب بچے باری باری اپنا سبق سناتے جو اچھا سبق سناتا اسے کسی قسم کی نفیس مٹھائی یا بادام کی خانہ زاد لوزاتیں ملتی تھیں اور جسے سبق یاد نہ ہوتا اسے نہیں دی جاتی تھیں اور گھرک دیتے تھے، نہایت سخت اور خفگی کا لفظ جو ان کی زبان سے کسی کی نسبت نکلتا تھا وہ لفظ "بے پیر" تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اس کلمے کا استعمال بھی ایک خاص تہذیبی رویے کو ظاہر کرتا ہے جس میں استاد کی راہنمائی کے بغیر پڑھنے کو معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ بعد کے زمانے میں بھی کوئی بڑا مشہور آدمی بھی اگر کسی استاد کے خوانِ علم سے مستفیض نہ ہوا ہو تو مخالفین اسے بے استادا کہہ کر طعن توڑا کرتے تھے۔

سرسید نے اپنے درس کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک بار 'بوستان پڑھاتے ہوئے' انھوں نے اس شعر کا ترجمہ کرنے کو کہا:

طمع راسہ حرف است و ہر سہ تہی
وزان نیست مر مطمعان را بہی (32)

سرسید نے پہلے مصرعے کا ترجمہ کیا: "طمع کے تین حرف تینوں خالی" نانا نے اس پر ہونہہ کہا۔ سرسید متنبہ ہوئے کہ کچھ غلط ہو گیا، غور کیا اور دوبارہ وہی ترجمہ کیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ اس پر نانا خفا ہوئے اور کہا "بے پیر سبق یاد نہیں کرتا" لیکن بتایا کچھ نہیں اور اس روز کوئی انعام بھی نہیں دیا۔ سرسید کو بہت رنج ہوا اور برابر آنسو آنکھوں سے جاری ہوئے۔ بہت دیر کے بعد سرسید کو سمجھ آئی کہ انھوں نے است کا ترجمہ نہیں کیا تھا۔ جب یہ بات واضح ہوئی تو ہم درسوں نے خوب نشانہ بنایا اور کہنے لگے کہ "مشتی کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد"......یعنی وہ مکہ جو جنگ کے بعد یاد آئے اپنے ہی منہ پر مارنا چاہیے......یہ بہ ظاہر تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن حقیقت میں اس طریقے سے نانا نے نواسے کو بہت بڑا سبق دے دیا کہ جب کسی دوسرے متن کا ترجمہ یا نقل کریں تو ایک ایک حرف کا خیال رکھیں۔ متن کے ساتھ وفاداری ازبس ضروری ہے۔ یہاں رک کر بعد کے زمانے میں سرسید کے تدوینِ متن کے کاموں کو یاد کر لیا جائے۔ سرسید ہمارے ہاں جس طرح اور بہت سے کاموں میں اوّلیت کا اعزاز رکھتے ہیں اسی طرح تدوینِ متن کی دنیا میں بھی انھیں یہ اعزاز حاصل ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ تدوین کے سفر میں متن کے ساتھ وفاداری میں انھیں نانا کے اس سبق سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہو گا۔

## غالب

مرزا غالب سے سرسید کا تعلق نیاز مندانہ تھا۔ غالب کی ولادت ۱۷۹۷ء کی ہے جبکہ سرسید ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے، یوں دونو کی عمروں میں اکیس برس کا فرق تھا۔ خورد ہونے کے ناتے اور خاندانی روابط کے باعث سرسید، غالب کو چچا کہا کرتے تھے۔ سرسید نے آثار الصنادید میں غالب کے فیض تربیت کا اقرار کیا ہے اور ان کے ساتھ اپنے دلی تعلق کو 'دلہارا بدلہا راہ باشد' کے آئینے میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ سرسید کا کہنا ہے کہ غالب ان کے حال پر ایسی شفقت فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی جانب سے خوردوں پر ایسی شفقت کا شاید ہی کسی نے مشاہدہ کیا ہو گا۔ سرسید کے نزدیک غالب کا ایک حرف ایک کتاب سے بہتر اور ان کا ایک گل پورے گلزار سے بڑھ کر ہے۔[33] حالی کے بہ قول غالب کو بھی "سرسید کی خاطر بہت عزیز تھی اور وہ ان سے اور ان کے خاندان والوں سے مثل یگانوں کے ملتے تھے"[34] **آثارالصنادید** کی تقریظ میں غالب نے

غایت درجہ تعریف و توصیف کے ساتھ سر سید کے ساتھ اپنے ربط ضبط کو بھی بہت محبت سے بیان کیا ہے۔ غالب کے الفاظ میں سر سید کے ساتھ ان کے تعلق میں "باہمگنانش دلیست از فرزانگی بآئین مردمی داناوبامنش پیمان مہریست از دلنشینی بہ پیوند خون" کی کیفیت تھی۔(35)

اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی روایت کو ملحوظ رکھاجائے تو ہماری معلومات میں یہ اضافہ بھی ہوتا ہے کہ غالب کی پنشن اور دربار و خلعت کی بحالی کے معاملے میں "جن لوگوں نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لیے خاص طور پر کوشش کی تھی...... ان میں سر سید مرحوم بھی تھے"(36)

غالب اور سر سید کے باہمی تعلق کے بعض دوسرے مظاہر بھی ہمارے علم میں ہیں مثال کے طور پر یہ کہ غالب، سر سید کے برادرِ بزرگ سید محمد سے تعلق خاطر رکھتے تھے جو بہ قول غالب ان کے "دوست روحانی" تھے۔ اس ناتے سے وہ سید محمد کے **سید الاخبار** کو بھی عزیز رکھتے تھے اور ان کے دیوان کا پہلا ایڈیشن اسی اخبار کے مطبعے سے شائع ہوا تھا۔(37)اسی طرح سر سید کے بڑے ماموں خواجہ وحید الدین کو جب کسی گورے نے ان کے گھر میں گھس کر گولی کا نشانہ بناڈالا تو غالب نے اس موقع پر تاریخ کہی "خود ہمین ناظر وحید الدین بود سال وفات" /۱۲۷۴ھ اس سے بھی سر سید کے ساتھ ان کے خاندانی روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔(38)اس کے علی الرغم اگر یہ کہاجائے کہ "سر سید سے غالب کے تعلقات کبھی زیادہ مخلصانہ نہیں رہے"(39)تو یہ باعث تعجب ہے۔باعث تعجب ہی نہیں آئندہ سطور سے واضح ہو گا کہ یہ رائے خلافِ واقعہ بھی ہے۔غالب اور سر سید، دونو معاشرے کے اونچے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور دونو خانوادوں کے درمیان باہمی روابط بھی تھے۔ **آثارلصنادید** میں سر سید کے ترجمہ ءغالب کا پہلے ذکر ہوا جس میں بہ قول ایوب قادری "مرزا کی تعریف میں سر سید احمد خان نے قلم توڑدیا ہے"(40) **آثارلصنادید** پر غالب کی تقریظ سے بھی ان روابط کا اندازہ کیاجاسکتاہے، جس میں اگرچہ اس زمانے کی روش کے مطابق خاصی لفاظی دکھائی دیتی ہے لیکن پھر بھی اس میں، سر سید اور ان کے خانوادے کے ساتھ غالب کی قلبی وابستگی کا چراغ بھی روشن دکھائی دیتا ہے۔

دونوں کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایاجاسکتاہے جو حالی نے **حیات جاوید** کے ایک حاشیے میں میں رقم کیا ہے۔حالی راوی ہیں کہ جب سر سید مرادآباد میں تھے تو

مرزاغالب ان دنوں میں نواب یوسف علی خان سے ملنے رام پور گئے سرسید کو ان کی آمد کی اطلاع نہیں تھی لیکن جب وہ واپس جانے لگے تو سرسید کو اطلاع ہوئی۔ سرسید فوراً ان کی جائے قیام پر پہنچے اور مرزا صاحب کو ان کے تمام سامان اور ساتھیوں سمیت اپنے مکان میں لے آئے۔ سرسید کے گھر آتے ہوئے مرزاغالب کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی جسے انھوں نے ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا، سرسید کو یہ بات مناسب نہ لگی اور انھوں نے وہاں سے بوتل اٹھا کر اندر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھوا دی۔ غالب نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے سرسید نے اطمینان دلایا کہ آپ خاطر جمع رکھیں، میں نے اسے بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ غالب کا اضطراب دور نہ ہوا اور انھوں نے کہا بھئی مجھے دکھاؤ تم نے بوتل کہاں رکھی ہے؟ سرسید نے غالب کو کوٹھڑی میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ غالب نے بوتل کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے؟ شاید تم نے اسی لیے کوٹھڑی میں لا کر رکھ دی تھی، حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظان کین جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چون بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند (41)

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے اور غالب دو ایک روز سرسید کے ہاں رہ کر واپس دلی چلے گئے۔(42)

حالی نے تو سرسید کے ہاں غالب کے قیام کی مدت دو ایک روز بتائی ہے لیکن ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے تفتہ اور حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام غالب کے دو خطوط سے استشہاد کیا ہے کہ وہ مراد آباد پہنچ کر بیمار ہو گئے اور پانچ دن تک سرسید کے ہاں رہے۔(43) ڈاکٹر صاحب نے اس جانب توجہ نہیں فرمائی کہ جن خطوط سے انھوں نے استشہاد کیا ہے وہ دونو ۱۸۶۶ء کے مکتوبہ ہیں جب کہ سرسید ۱۸۵۸ء میں صدرالصدور ہو کر مراد آباد آئے اور ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور ہوا۔ اس لیے ۱۸۶۶ء کے خطوط میں جس سفر مراد آباد کا ذکر ہے اس کا اطلاق حالی کے بیان کردہ سفر پر نہیں کیا جا سکتا۔

سر سید اور غالب کی یہ ملاقات بجائے خود اہم ہے اوراس سے جانبین کے تعلق کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کیاجاسکتاہے۔ آئین اکبری کی تقریظ (تفصیل آگے آتی ہے) کے معاملے نے جو تکدر پیدا کر دیا تھا اس کے باوصف باہمی حسنِ ظن قائم تھا جو حسنِ تعلق کی بحالی کا ذریعہ بھی بن گیا۔ یہ حکایت فاروقی صاحب ہی کے ہاں دراز نہیں ہوئی مولانا غلام رسول مہر نے بھی اس پر قیاس آرائی فرمائی ہے۔ ان کے قیاس کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد کا مضمون ہے جس کی توسیع کرتے ہوئے انھوں نیمنقولہ بالا واقعہ نقل کرنے کے بعد یہاں تک فرمادیاہے کہ:"اس موقع پر سر سید کو غالب کی پریشان حالیوں کی پوری کیفیت معلوم ہوگئی ہوگی اور انھوں نے پنشن اور دربار وخلعت کے لیے سعی میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھاہوگا چونکہ پنشن حکام دہلی کی رائے کے خلاف حکام صدر کے احکام سے بحال ہوئی تھی اس لیے اغلب ہے یہ سر سید کی مخلصانہ مساعی کا نتیجہ ہو"[44]

اس تمام پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر سر سید، غالب سے کوئی فرمائش کریں، انھیں چند شعر کہنے کی زحمت دیناچاہیں یا اپنی کسی کتاب پر ان سے تقریظ کے خواہاں ہوں تو اس میں تعجب ہی کیاہے۔ یہ دونو چیزیں تو اس زمانے کے عام معمولات میں سے تھیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید نے غالب سے اپنے ارسال کردہ شعروں کو تضمین کرنے کو کہا ہو یا اپنی تصحیح کردہ کتاب آئین اکبری پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی ہو۔ ہر بار انھیں حسب مراد جواب نہ ملا۔

غالب نے اپنے تلامذہ کے کلام پر بہ کثرت اصلاحیں دی ہیں ان کے تلامذہ میں چھوٹے بڑے سبھی شامل ہیں یہاں تک کہ امرا اور بادشاہ بھی ان سے فیض پاتے رہے۔ غالب اپنے شاگردوں کو فنی اسرار ورموز سے آگاہ کرتے ہیں، الفاظ وتراکیب کے استعمال کا سلیقہ سکھاتے پائے جاتے ہیں، مطالب ومعانی کی صراحت کے ذریعے شعری لطافتوں اور نزاکتوں سے آگاہ کرتے ہیں یہاں تک کہ تلامذہ اور نیاز مندوں کے کلام پر ان کی اصلاحیں ان کے تنقیدی تصورات کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ تلامذہ اور نیاز مندوں کی قلمی کاوشوں پر غالب کی رائے زنی کا ایک پہلو ان کا خوردوں کی حوصلہ افزائی کارویہ بھی ہے۔ بسااوقات انھوں نے کمزور کلام پر بھی داد دی ہے اور معمولی قلمی کاوشوں کو بھی اونچے سروں میں سراہاہے۔ اس کا سبب کشادہ ظرفی بھی

ہو سکتا ہے اور معاشرتی خیر سگالی بھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ سر سید کے باب میں غالب خاصے کھر درے نقاد واقع ہوئے۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ "سر سید احمد خان سے غالب کی خط و کتابت بھی رہتی تھی"(45) البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے مجموعہ مکاتیب میں ایک خط سر سید احمد خان کے نام بھی ہے۔ فارسی میں لکھا گیا یہ خط جہاں غالب کے پیچ آہنگی اسلوب کا نمائندہ ہے وہاں اس سے غالب کے تصور شعر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ سر سید نے انھیں غلام امام شہید (م:۲/اکتوبر۱۸۷۹ء) کے اشعار اس فرمائش کے ساتھ بھیجے کہ غالب انھیں تضمین کر دیں۔ اس زمانے کی عام ادبی روش کو ملحوظ رکھا جائے تو اپنے کسی عزیز کی جانب سے یہ مطالبہ کوئی ایسا غیر معمولی مطالبہ نہیں تھا لیکن غالب نے اس فرمائش کا جو جواب دیا وہ خاصا خلافِ معمول اور خاصا کھر درا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے غالب کے خط کے تیور دیکھ لیجیے:(46)

بنام جواد الدولہ سید احمد خان بہادر منصف فتح پور نواب معلی القاب وسید عالی جناب

خدا آپ کو سلامت رکھے۔

جناب کے فرمانِ الفت آثار کے پہونچنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ لیکن جس کام کی تعمیل کا حکم دیا گیا ہے اس سے رنجیدہ (ہوا)۔ کسی (شاعر) کے ایک دو شعر لے کر اس کلام پر اپنی طرف سے دو چار اشعار کا اضافہ کر دینا (بھلا) کون سا اصول سخن وری اور انداز معنی پروری ہے۔ خاص طور پر یہ دو اشعار کہ جن میں سوائے عربی کے بھاری بھر کم الفاظ کے کوئی نازک خیالی موجود نہیں۔ اور مزید یہ کہ یہ ایسی بحر میں کہے گئے ہیں کہ ایرانیوں میں سے بھی کسی نے اس بحر میں غزل نہیں کہی۔ اس میں دو اشعار بڑھا کر چاہے اس کو مسدس نام دیں یا ترجیع بند کے نام سے پکاریں۔ خصوصاً یہ اس لائق ہیں کہ بھکاری ان کو یاد کر لیں اور دروازے دروازے پُرسوز لَے میں گاتے پھریں اور خاتم المرسلینؐ کا کوئی عاشق یہ اشعار سن کر بے خود ہو جائے اور کوئی اپنا گریبان پھاڑ ڈالے۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔

مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے اور اس سے بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ شاعری اور سخنوری نہیں ہے۔ یہ کوئی دوسری چیز ہے جسے مجلسِ مولود شریف کہا جا

سکتا ہے۔ اس فقیر نے نعت اشرف المرسلین علیہ وآلہ السلام میں قصیدے اور مثنویاں کہی ہیں۔ ان تمام میں سے ایک مثنوی نقل کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ اس کو دیکھیں اور پڑھیں اور اس خادم سے ایسے اشعار کی جو شیوۂ سخنوری کے خلاف ہوں آرزو نہ کریں اور مجھے اپنا خادم تصور کریں۔ اور اپنے برادر بزرگ کی خدمت میں میرا اسلام پہونچائیں۔ والسلام۔ از اسد اللہ۔

اس جواب سے غالب کے تصور تضمین و سخن وری پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اپنے مخاطب کے ساتھ ان کے تعلق کے اخلاص کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اخلاص یہ تو نہیں ہوتا کہ اپنے عزیزوں کی ہاں میں ہاں ملائی جاتی رہے اور وہ جو بھی فرمائش کیا کریں اسے سوچے سمجھے بغیر پورا کر دیا جائے۔ اخلاص کا تقاضا یہ بھی تو ہے کہ دوسرے کی درست راہ نمائی کی جائے معاملہ سخن کا ہو تو اسے سخن کے درست معیاروں سے آشنا کروایا جائے۔ یہ بتایا جائے کہ محض بھاری بھرکم لغات جمع کر دینے سے شاعری جنم نہیں لیتی،اس کے لیے نزاکتِ خیال اور بحر کی موزونیت کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اگر کسی سخن کو گلی کوچوں میں گداگر گاتے پھریں تو یہ معیارِ سخن پر پہنچنے کی دلیل نہیں بلکہ 'کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے' کے مطابق شیوۂ سخن وری کچھ اور ہے۔

فقط یہی نہیں کہ یہ خط مخاطب کی تربیت کے لیے خلوص کی سفا کی کا مظہر ہے بلکہ اس سے ذاتی اور خاندانی ربط ضبط کا پہلو بھی واضح ہو رہا ہے جس کے تحت غالب اپنے مخاطب کی جانب سے ملنے والے خط کو فرمانِ الفت آثار اور باعثِ مسرت قرار دے رہے ہیں پھر اس کی راہ نمائی کے لیے اپنے کلام میں سے ایک مثنوی بہ طور نمونہ بھیج رہے ہیں تا کہ مخاطب کو معیاری شاعری کا اندازہ ہو نیز یہ کہ مکتوب الیہ کے برادر بزرگ کی خدمت میں سلام بھیجتے ہیں جن کی نسبت ان کا خیال پہلے نقل ہو چکا ہے کہ وہ ان سے اپنے تعلق کو روحانی تعلق قرار دیتے ہیں۔ ضمنی طور پر یہاں اس امر کی وضاحت بھی مفید ہوگی کہ تضمین چونکہ "پذیرانیدن و ضامن گردانیدن کسی رادر پناہ خود، آوردن و درآوردن شعر مشہور دیگری رادر پناہ خود"(47) کا عمل ہے اور غالب فنی اعتبار سے جس شاعر کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے۔(48) وہ صورت تضمین میں بھی اس کے اشعار کی پذیرائی نہیں کرتے۔

اب ہم آتے ہیں غالب اور سر سید کے باہمی ربط ضبط میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر جانے والے اس واقعے کی جانب جس نے ایک زمانے میں دونو کے قدیم تعلق کے علی الرغم باہم 'حجاب' پیدا کر دیا تھا۔

اس واقعے کا تعلق **آئین اکبری** اوراس کی تقریظ سے ہے۔ **آئین اکبری** اکبر کے نورتن اور فیضی کے چھوٹے بھائی ابوالفضل علامی (۱۴/ جنوری ۱۵۵۱ء...... ۲۲/ اگست ۱۶۰۲ء) کی تصنیف ہے۔ جس میں انتظامیہ کے مختلف شعبوں کا طریق کار اور ان کی کار کردگی بیان کی گئی ہے۔ کتاب پانچ دفتروں پر مشتمل ہے۔ پہلے تین دفتر عہد اکبری کی انتظامیہ کے مختلف شعبوں کے آئین سے متعلق ہیں چوتھا دفتر دساتیر ورسوم ہنود پر اور پانچوں اقوال وافکارِ اکبر سے متعلق ہے۔

حالی نے لکھاہے کہ جب سر سید دلی میں منصف تھے تو دلی کے ایک مشہور تاجر کتب نے ان سے **آئین اکبری** کی تصحیح کا مطالبہ کیا اور اس کے عوض انھیں سولہ سو روپے کے بہ قدر کتاب کے مطبوعہ نسخے دینے کی پیش کش کی۔(49) یہ کام سر سید کی افتادِ طبع کے مطابق بھی تھااور تاجر موصوف کی جانب سے پیش کش بھی پر کشش تھی لیکن سر سید کے اپنے اخلاقی معیاروں نے انھیں اس معاہدے کی اجازت نہ دی۔ وہ چونکہ دلی میں منصف کی حیثیت سے بر سر کار تھے اس لیے انھوں نے دلی ہی کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے آپ سر سید کے اخلاقی معیاروں کی بلندی کا اندازہ کرسکتے ہیں تاہم جب وہ بجنور پہنچ گئے اور دلی سے وہ رسمی تعلق جو اس معاہدے کی راہ میں مانع ہوا تھا، نہ رہا تو انھوں نے یہ کام کرنا شروع کر دیا۔

ہمارے زمانے میں جبکہ مطبع کا فن غیر معمولی ترقی کر چکا ہے اور فن تصنیف و تالیف بھی ماضی سے بدرجہا آگے بڑھ چکا ہے مصنفین اور طابعین کی محنت و کوشش کے باوصف مطبوعہ کتابیں اغلاط سے پاک نہیں ہوتیں تو ماضی میں کم سواد کاتبوں کے لکھے ہوئے مخطوطات کی عبارتیں کیونکر اغلاط سے محفوظ ہوسکتی ہیں۔ جو کتاب متعدد بار نقل ہوئی ہو اس کا متن مغشوش ہو جاتا ہے۔ یہی حال بہت مقبول متون خاص طور سے قبول عام پانے والے شعری ونثری متون کا ہوا کرتا ہے۔ ایسے میں سب سے پہلے نسخوں کی فراہمی اور ان کی درجہ بندی کرنا ہوتی ہے۔ کسی تحریر یا نگارش میں "ایسے الفاظ ہوسکتے ہیں جو کسی خاص تہذیبی، لسانی یا مذہبی اثرات کا رہ آورد ہوں ان کو سمجھنے یا

ان کو حل کرنے میں ان سے متعلق وسائل سے مدد لی جاتی ہے"(50) کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنی جگہ درست ہوتا ہے قاری اپنی کم علمی یا لاعلمی کے باعث اس کی درست خواندگی یا تفہیم پر قادر نہیں ہوتا۔ متن کسی بھی نوعیت کا ہو اس کی خواندگی اور تصحیح یا تدوین میں اس نوع کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں۔

تدوین متن کے اصول کے مطابق سرسید نے سب سے پہلے اس کے موجود نسخوں کی فراہمی کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس تلاش میں انھیں مغشوش نسخوں کے ساتھ ایک آدھ اچھا نسخہ بھی مل گیا۔ سرسید کی شخصیت میں بہت سے ایسے عناصر تھے جن کے باعث وہ ابوالفضل اور اس کی آئین اکبری کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ اکبر کی طرح وسیع المشرب اور ابوالفضل کی طرح ذوق تصنیف و تالیف سے متصف تھے۔ انھوں نے جب مرادآباد میں اپنا پہلا مدرسہ قائم کیا تو اس کے نصاب میں بھی **آئین اکبری** کا منتخب حصہ شامل کیا۔ جو کتب صدیوں سے نقل ہوتی آرہی ہوں ان کے متون میں بہ کثرت اختلافات درآتے ہیں۔ اس لیے ان کے کسی ایک نسخے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید نے ایک اچھے محقق کی طرح **آئین اکبری** کے آٹھ نسخے تلاش کیے اور بڑی جانکاہی کے ساتھ ان کی مدد سے اس کا معیاری متن تیار کیا۔ متن کی ایسی مشکلات، مرورِ زمانہ کے باعث جن کی تصحیح و تحقیق دشوار تر ہو گئی تھی بعض دوسرے معاصر متون کے ذریعے حل کی گئیں۔ اکبر کے زمانے میں اشیا کی قیمتوں اور اوراوزان کو اپنے زمانے کے مطابق تبدیل کیا۔ مصنف کے متن میں رہ جانے والی کمیاں بھی دور کیں مثال کے طور پر ہندوستان آکر رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانے والے بزرگوں، شاعروں، سیاحوں اور حملہ آوروں کے نام جو ابولفضل کے ہاں نامکمل رہ گئے تھے یا زمانہء اکبر کی اشیا کے اوزان اور ان کی قیمتیں۔ زمانہء اکبر کے محاصل و مسکوکات پر تحقیق کرکے ان کا اپنے زمانے سے تقابل بھی کیا، صرف یہی نہیں کتاب میں جابجا تصویروں کا اضافہ بھی کیا۔ عہدِ سرسید میں اس نوع کی تدوین متن کا کوئی اور کام ہمارے علم میں نہیں۔ بہت سے پہلوؤں سے اس کام کو تدوین متن کا اوّلین نمونہ کہا جاسکتا ہے البتہ معیاری متن کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پاورق یا پایان کتاب میں اختلافِ نسخ بھی درج کیے جائیں۔ سرسید نے اس کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ دراصل ان کے نزدیک قدیم متن کی تدوین کا مقصد اسے اپنے عہد کے

قاری کے لیے خوانا بنانا تھا اور بس، اسی لیے انھوں نے اندراجات میں بھی تبدیلی کو روا رکھا حالانکہ کسی مدوّن کو متن میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ حواشی میں تقابلی مطالعہ پیش کر سکتا ہے یا مقدمہ اس کے لیے موزوں مقام ہو سکتا ہے۔ مقدمہ کی ضرورت اس کے علاوہ بھی برقرار رہتی ہے جس میں محقق کو موضوع کی ضرورت و اہمیت، قبل ازیں انجام دیے گئے کاموں، اپنی روشِ تحقیق اور ترجیحات پر روشنی ڈالنا ہوتی ہے، زیر تدوین نسخے اور مصنف کے بارے میں بتانا ہوتا ہے۔ حالی نے بتایا ہے کہ سرسید نے جب اوّل اوّل **آئین اکبری** مدوّن کی تو اس میں ان کا ایک دیباچہ بھی شامل تھا جو دراصل **آئین اکبری** پر ایک مفصل ریویو کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مفصل دیباچہ انقلاب ستاون کے ہنگامے میں سرسید کے تدوین کردہ متن کے زیر اشاعت حصوں کے ساتھ ضائع ہو گیا۔ گویا اب کتاب مقدمے اور حواشی کے بغیر ہے۔ جدید اشاعت میں اشاریے البتہ شامل کر دیے گئے ہیں۔(51) لیکن یہ اشاریے مکمل طور پر قابل اعتماد نہیں ہیں۔ کتاب عہد اکبری سے متعلق بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے صرف دانش اندوزان جاوید دولت اور قافیہ سنجان کے ابواب ہی دیکھے جائیں تو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی آنکھیں روشن ہو جائیں۔ محاصل، مسکوکات اور دیگر انتظامیات کے ابواب میں تو جس قدر جانکاہی سرسید نے کی ہے اس کا اندازہ متعلقہ شعبوں کے ماہرین لگا سکتے ہیں لیکن افسوس کہ سرسید کی اس محنت اور کتاب کی افادیت پر توجہ نہیں ہو سکی۔ سرسید نے اس متن پر اس قدر محنت کی کہ بہ قول خود "مدتی نقد روان عمر درین کار صرف شد"(52) ایک مدت تک نقدِ روان عمر اس کام میں صرف ہو گیا۔

یہ کام تھا جس پر حسبِ دستورِ زمانہ سرسید نے مختلف معاصرین سے تقاریظ کی فرمائش کی۔ مثال کے طور پر امام بخش صہبائی جن کی تقریظ آج بھی خاتمۃ الطبع کے بعد کتاب میں شامل ہے۔(53) خاندان کے ایک بزرگ اور اپنے محترم ہونے کی حیثیت سے سرسید نے چاہا کہ مرزا غالب بھی اس کتاب کی تقریظ قلمبند فرمائیں چنانچہ انھوں نے غالب سے یہ فرمائش کر ڈالی۔

مولانا حالی کے بہ قول مرزا غالب پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں۔ مرزا چونکہ صلح جو اور مرنج و مرنجان طبع تھے اس لیے کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے مگر تقریظ نگاری کا انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو اور صاحب کتاب خوش

بھی ہو جائے۔ بہت سا حصہ تمہید میں یا مصنف کی ذات اور اس کے اخلاق یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں یا اور لطیف اور پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل نہ ہوں ختم ہو جاتا تھا آخر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے لکھ دیتے تھے۔[54] ان کے شاگرد عزیز مرزا ہر گوپال تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ میں تعریف کی کمی کا شکوہ کیا تو غالب نے انھیں اپنی متعدد تقریظیں اور قصائد دیکھنے کا مشورہ دیا تا کہ انھیں اندازہ ہو کہ وہ تقریظ نگاری میں کس روش کے حامل ہیں۔

اس پس منظر میں سرسید کا اپنی تصحیح کردہ **آئین اکبری** کے لیے غالب سے تقریظ کا مطالبہ کرنا کچھ ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں تھا اور اگر غالب اپنی روش عام کے مطابق اس کام پر سرسید کی حوصلہ افزائی پر مشتمل ایک توصیفی یا نیم توصیفی تقریظ لکھ دیتے تو کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ **آثارالصنادید** پر بھی تقریظ لکھ چکے تھے جس میں سرسید کے ساتھ اپنے محبانہ تعلق کو خونی رشتے جیسا قرار دیا ہے لیکن سرسید کے اس کام پر تقریظ کی فرمائش کے جواب میں غالب کا طرز عمل یقیناً غیر معمولی تھا۔ غالب کا یہی طرز عمل ہے جس کے باعث ہم غالب کو سرسید کے مربی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور سرسید کی شخصیت میں آنے والے انقلاب کے پیچھے ہمیں غالب کے فہم و بصیرت کا چراغ روشن دکھائی دیتا ہے۔

غالب نے نہ صرف یہ کہ **آئین اکبری** کی کوئی تعریف نہیں کی بلکہ سرسید کی اس محنت کو بھی، جو انھوں نے اس کام میں دکھائی تھی، لائق تعریف نہ سمجھا۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے اس کام کو نہیں دیکھا یا اس کی تعریف کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ نہیں، انھوں نے اس کام کو دیکھا اور رائے قائم کی اور پوری دیانت داری سے اس رائے کا اظہار بھی کیا۔ یہ اظہار اٹھائیس اشعار کی ایک مثنوی کی صورت میں ہوا۔ انھیں ابوالفضل کا طرز تحریر بھی پسند نہیں تھا اور جو دساتیر اس زمانے سے متعلق اس کتاب میں درج تھے وہ بھی ان کے نزدیک لائق اعتنا نہیں تھے۔ یہ تو درست ہے کہ بیتے زمانے کے دساتیر زمانہء غالب میں کیونکر لائق اعتنا ہو سکتے تھے لیکن ان کی ایک تاریخی اہمیت تو بہ

ہر حال تھی، غالب نے اس سے بھی صرف نظر کیا اور ان پر سر سید نے جو "نقدروان عمر" صرف کیا تھا اس سے بھی۔ وہ ویسے بھی تاریخ کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔اس لیے انھوں نے اسے ایک کارِ فضول سمجھا اور اپنی روشِ راست گفتاری کے مطابق ایسا ہی اظہار بھی کیا۔ راستی اور راست گفتاری کے بارے میں وہ اپنا شیوہ ایک غزل میں یوں بیان کر چکے ہیں کہ:

راست گفتارم و یزدان نہ پسندد جز راست

حرف ناراست سرودن روش اہرمن است (55)

**آئین اکبری** کی تقریظ میں انھوں نے کچھ باتیں تو **آئین اکبری** سے متعلق کہیں کچھ سر سید کے بارے میں اور کچھ بدلتے زمانے کے بارے میں۔

سر سید کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک عالی ہمت شخص ہیں،وہ سر تاپا علم اور شکوہ کی تصویر ہیں اور غالب ان کا پرستار ہے۔ان کے اس کام سے آنکھیں روشن ہوئیں اور بازوؤں میں قوت آئی اور کہنگی نے جدت کا لباس زیبِ تن کیا۔ تاہم ان کا یہ کام ان کی بلند ہمتی کے شایان شان نہیں ہے اس کی داد وہی دے سکتا ہے جس کا شیوہ ریاکاری ہو۔ آخر میں وہ سر سید کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا اس کی ہر خواہش پوری کرے اور نیک بختی ہمیشہ اس کی خدمت میں حاضر رہا کرے۔

ہر چہ خواہد از خدا موجود باد

پیشکارش طالع مسعود باد (56)

**آئین اکبری** کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک دفتر پارینہ ہے جس سے نفع کی اب کوئی امید نہیں اگر یہ کہا جائے کہ اس میں قدیم دساتیر درج ہیں تو بدلے ہوئے زمانے میں یہ دساتیر کارآمد نہیں رہے۔ان کی حیثیت پرانی جنتری سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اب اس کتاب میں مندرج دساتیر سے بڑھ کر طور طریقے سامنے آچکے ہیں۔چنانچہ اس کتاب کے اندراجات، لائقِ اعتنا نہیں ہیں اور اب اس متاعِ کہنہ کا کوئی خریدار نہیں۔ اگر یہ

کہاجائے کہ اس کتاب کا طرز تحریر اچھاہے تو یہ بھی کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں،اس سے اچھے اچھے اسالیب کی حامل تحریریں بھی موجود ہیں:

کس مخر باشد بہ گیتی این متاع
خواجہ را چہ بود امید انتفاع (57)

بدلے ہوئے زمانے کے بارے میں غالب کی رائے یہ ہے کہ اربابِ انگلستان نے وہ کچھ کردکھایاہے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کیاتھا۔انھوں نے نظم حکومت میں جو روش اختیار کی ہے اور حصول توانائی کے جو ذرائع اختیارکیے ہیں ان کے سامنے پرانے طریقے بے کارہوکررہ گئے ہیں۔انھوں نے حرف کو پرندے کی طرح پرپروازعطاکردیے ہیں اور سازسے مضراب کے بغیر نغمے نکال کردکھا دیے ہیں۔ راتوں کے اندھیرے چراغوں کے بغیردور کردیے ہیں۔ مبدء فیاض بخیل نہیں ہے کہ اس نے انسانوں کو ماضی میں جو کچھ عطاکیااسی پر اکتفاکیے رہے۔اس نخل سے تازہ کھجوریں ٹپکتی رہتی ہیں:

مبدء فیاض را مشمر بخیل
نوز می ریزد رطب ہا زان نخیل (58)

اپنے اس ناقدانہ رویے کے حوالے سے غالب کاکہناہے کہ فن سخن میں جو کچھ میں جانتاہوں وہ کوئی اور نہیں جانتا۔میں مردہ پروری کو لائقِ تحسین نہیں سمجھتا۔عمومی طور پر اچھی بات کہنے کے مقابلے میں خاموش رہنابہتر ہوتاہے لیکن میں اگر اس کام کی داد بھی نہیں دے رہا اور اس باب میں خاموشی بھی اختیارنہیں کررہاتو میری یہ روش قابل دادہے۔ میں ریاکاری کا دشمن ہوں اور پاس وفا کے باب میں اپنامرتبہ میں خود پہچانتاہوں:

من کہ آئین ریا را دشمنم
در وفا اندازہ دان خود منم (59)

یہ اٹھائیس اشعار ایک غیر معمولی مثنوی کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں تقریظ نگاری کی عام مداحانہ روش کے برخلاف معروضیت سے کام لیاگیاہے اور بے باکانہ رائے ظاہر

کی گئی ہے۔ مولانا حالی نے ابوالفضل کے طرزِ تحریر، کتاب کے نفس مضمون اور مذاقِ تاریخ سے دوری کو غالب کی ناپسندیدگی کا سبب بتایاہے لیکن خود تقریظ کے اشعار اس سے بڑھ کر اسباب کی نشان دہی کررہے ہیں جیسے ڈاکٹرخورشیدرضوی کے الفاظ میں "غالب کا شعور مستقبل اور ان کی مردم شناسی کہاجاسکتاہے جس نے ان کے ذہن پر دوررس اثر چھوڑا اور ان کے مضمرامکانات کو جھنجوڑا"(60) غالب دراصل سرسیدمیں اس کام سے بڑھ کراور بہت بہترکاموں کی صلاحیت دیکھ رہے تھے اس لیے انھوں نے اس کام کی دادینے کی بجائے انھیں بدلتے زمانے کی جانب متوجہ کیا۔ گو وقتی طورپر خود سرسید کو بھی ان کی روش اچھی نہیں لگی اور انھوں نے غالب کی یہ تقریظ یہ کہہ کر واپس کردی کہ"ایسی تقریظ مجھے درکارنہیں"(61) اور وقتی طورپر تعلقات میں بھی تکدر آ گیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ غالب کی تمنایا پیش گوئی کے مطابق وہ ماضی پرستی سے نکل آئے اور ان کی نگاہیں ماضی سے ہٹ کر مستقبل کی جانب دیکھنے لگیں اور یوں فقط سرسید نہیں ان کے توسط سے پوری قوم کے مستقبل میں تبدیلی واقع ہوئی۔ اس طرح سرسیدکی تشکیل شخصیت اور ان کی خدمات کے پس منظر میں جہاں ہم ان کی والدہ اور ان کے نانا کی شخصیتوں کے محاسن کو جلوہ گردیکھتے ہیں وہاں غالب بھی ایک مخلص ومہربان مربی کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ایک ایسی بزرگ اور خیرخواہ شخصیت جس نے سرسید کو زاویہ نظر کی تبدیلی کی جانب بروقت متوجہ کیا،ایسی تبدیلی جس سے ان کی شخصیت اور ان کے کاموں پر بہت دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

## حوالےوحواشی

1۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید،لاہور:عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء،ص۳۳

2۔ محولہ بالا،ص۴۹

3۔ سر سید احمد خان، سیرت فریدیہ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۱۰ء، ص۶۸

4۔ محولہ بالا، ص۶۹

5۔ محولہ بالا، جائے مذکور

6۔ محولہ بالا، ص۷۰

7۔ محولہ بالا، جائے مذکور

8۔ محولہ بالا، جائے مذکور

9۔ محولہ بالا، ص۷۱

10۔ میر تقی میر، کلیات میر مرتبہ کلب علی خان فائق،لاہور: مجلس ترقی ادب، جلد ششم مثنویات، مثنوی در ہجو خانہ خود، ص۱۸۸

11۔ سیرت فریدیہ، ص۷۱

12۔ سر سید احمد خان آثارالصنادید مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۳ء، ص۱۷

13۔ حیات جاوید، ص۶۱

14۔ سیرت فریدیہ، ص۷۲

15۔ جائے مذکور

16۔ سیرت فریدیہ، ص۷۳

17۔ جائے مذکور

18۔ بخاری، کتاب الادب باب اثم القاطع، رقم ۵۹۸۴

19۔ آثارالصنادید، ۲/ ۴۷

20۔ سیرت فریدیہ، ص۷۲

[21] ۔ ایضاً، ص ۴۷

[22] ۔ ایضاً، ص ۴۳

[23] ۔ ایضاً، ص ۶۰

[24] ۔ سعادت خان ناصر خوش معرکہ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۷۰ء، ۱/ ۵

[25] ۔ سیرت فریدیہ، ص ۴۹

[26] ۔ ایضاً، ص ۶۱

[27] ۔ ایضاً، ص ۵۳

[28] ۔ ایضاً، ص ۶۲

[29] ۔ جائے مذکور

[30] ۔ سیرت فریدیہ، ص ۶۳

[31] ۔ محمد مسیح الدین، حواشی ابوالکلام آزاد، لاہور: مکتبہ قدوسیہ، جنوری ۱۹۹۲ء ص ۲۵۴، ۲۵۵

[32] ۔ سرسید نے اسے بوستان کا شعر قرار دیا ہے لیکن ہمیں بوستان کے محقق نسخوں کجا پورے آثار سعدی میں یہ شعر نہیں ملا۔ کسی غیر معتبر نسخے میں الحاقی متن کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا۔

[33] ۔ آثارالصنادید، ۲/ ۱۱۷

[34] ۔ الطاف حسین حالی یاد گار غالب (طبع اول ۹۸۱ ۷ء کی عکسی اشاعت) کراچی: ادارۂ یاد گار غالب ۱۹۹۷ء ص ۸۵

[35] ۔ آثارالصنادید، ۲/ ۲۳۱

[36] ۔ امالک رام صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین نثر ابوالکلام آزاد (ہریانہ: اردو اکادمی ہریانہ ۱۹۹۲ء) کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا مضمون "مرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام" بھی شامل ہے (ص ۱۷۴ تا ۱۸۷) لیکن افسوس کہ ناقص الآخر ہے اور اس اہم بات کے شمول کے بغیر غالب کے قصیدۂ مدحیہ

پر ختم ہو گیا ہے۔ ہم نے یہ اقتباس براہ راست مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال سے لیا ہے۔ دیکھیے: الہلال، جلد ۴ نمبر ۲۲۔ ۲۴/ رجب ۱۳۳۲ھ / ۱۷/ جون ۱۹۱۴ء، ص ۸

37۔ "یکی از دوستان روحانی منست" یہ بات غالب نے میجر جان جاکوب بہادر کے نام ایک خط میں کہی ہے، دیکھیے: میرزا اسد اللہ غالب، پنج آہنگ تدوین نو و تصحیح و تحقیق سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۲۹ء، ص ۴۳۱

38۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستان میں اردو اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۸، ۲۷۹

39۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، تلاش غالب، لاہور: کتابیات مئی ۱۹۶۹ء، ص ۴۲

40۔ محمد ایوب قادری، غالب اور عصر غالب، کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۲ء ص ۳۸

41۔ واعظان کاین جلوه در محراب و منبر می کنند　　چون بخلوت میروند آن کار دیگر می کنند

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی دیوان حافظ مرتبہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی تہران: انتشارات زوار، ۱۳۶۹ھ ش، ص ۳۲۸

42۔ حیات جاوید، ص ۸۱

43۔ تلاش غالب، ص ۴۷

44۔ مولانا غلام رسول مہر، غالب، لاہور: شیخ مبارک علی تاجر کتب، س۔ن، ص ۳۱۹

45۔ غالب اور عصر غالب، ص ۳۹

46۔ اصل خط فارسی میں ہے اور غالب کی دندان شکن فارسی کا یہ نمونہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

**نواب معلی القاب و سیّد عالی جناب سلامت**

**به رسیدنِ منشور رافت نشان شادمان شدم، وازان چه مرا بسر انجام ان فرمان داده اند، غمین بک دو بیت از دیگرے گرفتن و برآن گفتار دوچار بیت از خویش افزودن کدام آئین سخن وری و کدام شیوه معنی**

پروری است۔ خاصه این دو بیت که جُز شکوهِ الفاظ تازی ہیچ گو نه معنی نازک ندارد و سیما در بحرے واقع شده که ہیچ کس از ایرانیاں در آن بحر غزل نگفته، انچه بریں دو بیت افزابند۔ خواہی آں را مسدس نام نہند و خواہی ترجیع بند خوانند۔ خاص از بہر انست که گدایان یاد گیر ندوبر درہا بآہنگ حزین بخوانند۔ کدام عاشق خاتم المرسلین بسماع این اشعار از خود رود و گریبان درد۔ حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلّمه اللّٰه تعالیٰ ہر چه گفته اند خوش گفته اندو خوشتر ازین نتوان گفت۔ لیکن این شاعری و سخن وری نیست۔ چیزے دیگر ست که در مجلس مولود شریف توان خواند۔ فقیر حقیر را در نعت اشرف المرسلین علیه و آله السّلام قصیده ہا و مثنویہا است، از ان حمله یکے مثنوی نقل کرده بخدمت مے فرستم، این را بنگرندو بخوانند و از بنده اشعارے که نه شیوۂ سخن گستران باشد آرزو نکنند و بندۂ خود انگارند و بخدمت مہین برادرِ خود سلمه اللّٰه تعالیٰ سلام رسانند۔ والسّلامه۔ (از اسد اللّٰہ)

[47]۔ مولوی غیاث الدین رام پوری غیاث، اللغات، کانپور: مطبع منشی نولکشور، ۱۸۸۷ء، ص ۱۰۱

[48]۔ تلاش غالب، ص ۴۸

[49]۔ حیات جاوید، ص ۸۷

[50]۔ تنویر احمد علوی متن کی تحقیق وترتیب مشمولہ تدوین متن کے مسائل پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰

[51]۔ آئین اکبری علی گڑھ، سر سید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء

[52]۔ آئین اکبری، خاتمة التصحیح، ص ۴۶۹

[53]۔ ایضاً، ص ۴۴

[54]۔ یاد گار غالب، ص ۴۸

[55]۔ میرزا اسد اللہ خان، غالب غزلیات فارسی مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور: مجلسِ یادگار غالب، پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص۱۳۲

[56]۔ میرزا اسد اللہ خان، غالب قصائد و مثنویات فارسی باہتمام غلام رسول مہر، لاہور: مجلس یادگار غالب، پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص۲۷

[57]۔ قصائد و مثنویات فارسی، ص۱۷

[58]۔ ایضاً، ص۲۷

[59]۔ ایضاً، ص۲۷

[60]۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، اطراف، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص۱۱۸

[61]۔ حیات جاوید، ص۸۱

★★★★★

# انگریزی مقالات

# ARMUGHAN

## Amanullah Khan


Compiled By

**Prof. Dr. Jamila Shaukat**
**Prof. Dr. Shahida Parveen**



**Institute of Islamic Studies**
**University of the Punjab, Lahore**

# Content


| | | | |
|---|---|---|---|
| 1. | ‘Ilm Al-Hadith and Its Influence on Historiography | Dr. Amanullah Khan | 1 |
| 2. | Early Muslim Historiography | Dr. Amanullah Khan | 11 |
| 3. | Al-Waqidi – An Assessment of His Position as an Historian | Dr. Amanullah Khan | 25 |
| 4. | Ahmad B. Dawud Abu Hanifa Al-Dinawari (d.c. 282 A.H./ 895 A.D.) | Dr. Amanullah Khan | 37 |
| 5. | Al-Baladhari and His Contribution to Muslim History | Dr. Amanullah Khan | 43 |
| 6. | A Critical Appraisal of Al-Tabari’s Contribution to Muslim Historiography | Dr. Amanullah Khan | 59 |
| 7. | The Legacy of Holy Prophet Muhammad (PBUH) and its Impact on the Development of Islamic Civilization – A Historical Perspective | Prof. Dr. Tahira Basharat | 69 |
| 8. | Managers’ Responsibilities in Stress Prevention at Workplace: An Islamic Perspective | Mr. Salman Ahmad Khan Zaighum/ Mr. Gulzar Ahmad | 83 |


☆☆☆☆☆

*Dr. Amanullah Khan

# ‘Ilm Al-Hadīth and Its Influence on Historiography

The Holy Qur'ān, ever since its revelation, has served as the basic source of inspiration and guidance for the Muslims of all times. It very clearly enjoins the believers to show obedience to Allah and to Prophet Muhammad (peace be upon him). Obedience to the Prophet is second only to the obedience to Allah. There are a number of verses in the Holy Qur'ān in this connection, e.g.

مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدۡ أَطَاعَ ٱللَّهَۖ([1])

[Whosoever obeys the Messenger, he indeed obeys Allah.]

قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِي يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ ([2])

[Say: if you love Allah, follow me, Allah will love you.]

The Muslims are further enjoined to accept the Prophet as the pertect Exemplar. The Holy Qur'ān says:

لَّقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسۡوَةٌ حَسَنَةٞ([3])

[Verily in the Apostle of God ye have a good example.]

Under the influence of such Qur'ānic injunctions and in obedience to such clear instructions of the Prophet as بلغوا عنى ولو آية ([4]) [Circulate from me though (it be) a sentence], the followers of Islam set out to collect and preserve the traditions of the Prophet his sayings,

* Journal of Research, University of the Punjab, Lahore, Vol. I, No. 2, pp. 163-171, July 1966

actions and silent approvals. They were, however, warned to proceed with great caution. The Prophet said:

بلغوا عنى ولو آية... ومن كذب على متعمداً فليتبواء مقعده من النار (رواه البخارى)(5)

[Circulate from me though (it be) a sentence....And whosoever fabricates falschood against me intentionally, let him seek his abode in fire.]

Every believer had to take the conduct of the Prophet as a model for himself in all the affairs of life. Consequently, great endeavour was made to preserve every picce of information regarding his conduct with perfect exactitude. How careful and strict were the four Orthodox Caliphs of Islam in the acceptance of tradition is a matter very well known to scholars of Muslim learning. In spite of this strict attitude the quest for collecting the prophetic words or reports of the Prophet's deeds went on increasing, and the devotees of Islam preserved the prophetic wisdom with great care and reverence. This attitude brought about the collection of a large amount of traditions about the practice of the Holy Prophet (PBUH).

In course of time as this record of traditions related to the prophetic practice increased in volume, misguided persons began to fabricate traditions and attribute them to the Prophet. The Muslims accepted the challenge of the fabricators and developed a "Science of 'Tradition" or 'Ilm al-Hadith by which they could judge the authenticity of the reports and the reliability of the reporters. What marvellous job they did in order to preserve the traditions related to the words and deeds of their Prophet and to discriminate the reliable from the unreliable, astonishes the world. The Muslims are rightly justified in taking pride in their Science of Tradition. In fact, they have no rival in the world in the task of collecting and preserving the details of life and the sayings and actions of their Prophet with perfect exactitude. What arduous task they performed in this field can be judged by the fact that, in order to sift the traditions of their Prophet, they preserved the records of lives of about half a million persons who were in any way involved in the narration *(riwayat)* of the Hadith.

Hitti, the well-known Orientalist and historian, says: "Among

all peoples Moslems stand unique in having developed a science (ilm) out of their mass of religious traditions."([6])

Juynboll, while appreciating the science of tradition, in his article on the critical investigation of *isnad*'s has caused the Muslim scholars to make thorough researches. They endeavoured not only to ascertain the names and circumstances of the authorities (*ridjal*) in order to investigate when and where they lived, and which ot them had been personally acquainted with the other, but also to test their reliability, truthfulness and accuracy in transmitting the texts, to make certain which of them were "reliable" (*thiqah*). This criticism of the authorities was called *al-djarh wa'-ta' dil* (wounding and authentication).... The so-called "knowledge of the men" the commentaries on the collection of Tradition therefore contain more or less copious details concerning the authorities.([7])

We come across scores of such works composed by the Muslim scholars as convey information about the life, character, reliability or unreliability and categories, etc., of the reporters of tradition. Some of such works are *Tabaqāt Ibn Sa'd, Usd al-Ghāba fī Ma'rifat al-Sahāba* of Ibn al-Athir, *Ṯabaqāt al-Huffāz,* by Dhahabi, *Shadharat al-Dhahab* by Ibn Imād, *al-Isāba fi Tamyīz al-Saḫāba* by Ibn Hajar al-'Asqalānī and *Lisān al-Mīzān* and *Tahdhīb al-Tahdhīb* by the same author.

Similarly, we see standard works composed on *'Ilm al-Hadīth* or the Science of Tradition. According to Ibn Hajar al-'Asqalānī, the first known comprehensive work of this type was composed by Abu Muhammad Ramahurmuzī.([8]) His work entitled *Kitab al-Muhaddith al-Fāsil bain al-Rāwī wa'l,...* is preserved in the form of a number of MSS. but has not yet been published.([9]) Ramahurmuzi was soon followed by al-Hākim Abu Abd Allah Muhammad b. Abd Allah al-Naisāburī (321-405 A.H.) who compiled *Kitāb Ma'rifat Ulum al-Hadith* in which he dealt with the whole subject, dividing the material into different categories. An edition of this work has been published by Dr. Mu'azzam Husain (Cairo, 1937). Other works on this subject are Al-Kifaya by Khatīb Abu Bakr, Ilmā' by Qādi 'Iyad and a treatise Ma La Yasa al-Muhaddithu Jahluhu by Abu Hafs Mianji. Another work of importance, which may be mentioned here, was composed by Hafiz Abu 'Amr 'Uthmān b. al-Salāh 'Abd al-Rahmān al-

Shahrazurī (d. 643 A.H.). His work is generally known as *Muqaddima lbn al-Salah.* Ibn Hajar al-Asqalani, the well-known traditionist and a great critic, already mentioned above, improved the arrangement of the work and prepared its summary giving it the name نخبة الفكر فی مصطلح اهل الاثر (*Nukhbat al- Fikar Fi Mustalih al-Athar*). As this work was considered too brief, Ibn Hajar wrote, on the demands of his contemporaries, a commentary on it known as *Sharh Nukhbat al-Fikar*.

This work may well be considered to be a classical work on *'Ilm al-Hadīth*. It was a natural and necessary step towards the systematisation of the various studies which had been carried on since the *Muhaddithun* (the Traditionists) began to investigate the credentials of transmitters and the value of their traditions.

Ibn Hajar has discussed the various aspects of this science in a very systematic order. According to the different chains (ways, *Turuq*) of transmitters the following categories are distinguished:

1. *Mutawātir:* A communication handed down from the very beginning to its compilation, through so many sources that there was no scope left of any objection and suspicion against it.
2. *Mashhur:* A statement which is handed down by at least three different authorities.
3. *'Azīz:* A communication which 1s transmitted by at least two persons.
4. *Gharīb* is in general a rare tradition. With reference to the *Isnad, Fard-i Mutlaq or Gharib-i Mutlaq* means a tradition which is transmitted in the second generation only by one Tabi'i and Fard-i Nisbi or Gharib-i Nisbi is a tradition which is transmitted by only one definite person of later generations.

The last three categories are further distinguished as *Ahad*. Such traditions are again of three grades, according to the authenticity and reliability of the reporters, viz. *Sālih* (sound), *Hasan* (good), and *Da'if* (Weak). Likewise, if the chain of transmitters is unbroken and complete, it is called *Muttasil*; and if the chain is broken or incomplete it is called *Munqati'*. Similarly, traditions have been placed into many categories like *Mu'allaq* (suspended), *Mursal* (defective), *Munkar* (unknown), *Ma'ruf* (known), *Shādh* (contradictory), *Marfu'* (raised), Mauquf

(retarded), etc.

Every Hadith has two parts: (a) *Isnād* (the chain of narrators), (6) *Matan* (the text). The text is suffixed to the *Isnad*. For example, in the tradition:

**حدثنی یحیی عن مالک، عن نافع عن عبد الله ابن عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صلاة الجماعة تَفْضُلُ صلاة الفذَّ بِسبعٍ وعشرين درجة**(10)

[Yahya reported to me on the authority of Malik, on the authority of Nafi', on the authority of Abd Allah ibn Umar that the messenger ot Allah (Peace Be Upon Him) said: Prayer in congregation is twenty-seven times better (as regards rewards) than one offered alone.]

From حدثنی to ابن عمر (Ibn ‘Umar) is *isnad* or chain of *rawis* and from ان *(Anna)* to the end is *matan* (متن) or text.

This method of giving the *Isnad* with the text, we find for the first time used by the Arabs. The history of any other nation does not contain the chain of narrators of every text along with it. It is completely lacking in the historical literature of the Greeks, the Romans, the Hindus and the Chinese.

It is remarkable that this method was also extended by the Muslims to other branches of learning such as history, geography, etc.

Margoliouth says, "The anxiety to know more about the Prophet and the heroes of early Islam led, as we know, to greater labour and effort among the Muslims than in any analogous case; and the study of the traditions of the Prophet is largely responsible for and to be credited with the growth of geography and biography; if the way to test the authenticity of a tradition was to estimate the trustworthiness of the transmitters, it was indispensable to learn as much as possible about their lives; it was necessary to know when and where they had lived, and this rendered geography and history requisite."(11)

In the beginning *Hadīth* and history were very closely related to each other, and it was from amongst the class of *Muhaddithun* that arose another class known as *Akhbariyyun* (the narrators of

traditions), the genealogists and the authors of the accounts of the campaigns of the Prophet (Peace Be Upon Him), who were later classified as historians.

Shaikh 'Abd al-Haqq Muhaddith Dehlvī considers history an indispensable branch of learning for the student of Hadith and mentions the close relation between these two branches thus:

> انقطاع اور سقوط راوی کا پہنچاننا، راوی اور مروی عنہ کے عدم ملاقات کی پہچان پر ہے اور دونوں کے درمیان عدم ملاقات اس طرح معلوم ہو سکتی ہے کہ یا تو یہ معلوم ہو جائے کہ راوی اور مروی عنہ کا آپس میں اجتماع نہیں ہوا اور راوی نے مروی عنہ سے اخذ و تحمل نہیں کیا اور راوی کو اجازت نہ ملی اور یہ سب باتیں علم تاریخ کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں جس میں رواۃ و ناقلین اور رجال و افراد حدیث کے پیدائش و اموات، زمانہ تحصیل حدیث اور سفر وغیرہ وغیرہ۔۔۔جملہ امور زندگی کے احوال کا بیان اور سوانح حیات اور حالات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر علم تاریخ و فن محاضرات محدثین اور مشائخ حدیث کے نزدیک۔۔۔ ایک بنیادی چیز ہے اور ایک درجہ میں علم حدیث کا علم تاریخ و محاضرات پر دارومدار ہے۔([12])
>
> [The knowledge of a broken chain of authorities and dropping of a reporter depend upon the information that the reporter and the person from whom he reported did not see each other, and this in turn can be ascertained by the tact that they did not meet each other, and the transmitter did not collect his information from whom he is transmitting and the reporter was not given an *ijaza* (permission) to transmit traditions. This all is known through history, which deals with the reporters, copyists and *rijal* (authorities) of Hadith, their birth, death, period of their collection of Hadith and their journey, etc.... in short with almost all the affairs of life. Due to this very reason the *Muhaddithun* and Mashaikh al-Hadith consider history...a very basic thing and of immense importance, and in one degree *'Ilm-al-Hadith* is based on history.]

All the scholars of Islamic history hold the view that the

Muslim historians off early period followed in their works on biography, genealogy, conquests and other historical composition, like local histories, *tabaqat*, etc., a style which was adopted by the traditionists in their oral and written transmission of Hadith. Even the form of their presentation was that of the Hadith, and it was primarily the study of Hadith which necessitated the study of history.

Professor Hitti in his article on "History" in the *Engyeopaedia of Social Sciônces*, while discussing the diferent infuences which were responsible for the development of Muslim historiography and while mentioning the early historical works composed by various Muslim scholars, observes:

In these carly historical works and in others which followed the torm of presentation was that of the stereotyped religious tradition (Hadith). Each event is related in words of eye-witnesses or contemporaries and transmitted to the final narrator-the author, through a chain of intermediary reporters. Thus al-Baladhuri introduces his story of the capitulation of Najran to the Prophet:

> Bakr ibn al-Haitham related to me that 'Abd Allah ibn Salih related to him, on the authority of al-Layth ibn Sa'd, on the authority of Yunus ibn Yazid al-Ayli, on the authority of al-Zuhri, who said....([13])

Appreciating this form of presentation, he continues, "this tracing of the event to its ultimate source served to develop exactitude, as did also the insistence on dating occurrences even to the month and day."([14])

Similarly, in his introduction to *Kitab Futuh al-Buldan*, he elaborates the above statement by saying: The chief source from which history writing flowed was tradition *(Hadith)*; it was a pious custom that when Moslems met, one should ask for news (Hadith), and the other should relate a saying or anecdote of Muhammad. Each event is related in the words of eye-witnesses of contemporaties and transmitted to the final narrator through a chain of intermediate reporters. The authenticity of the reported fact depends on (1) the continuity of the chain and (2) the confidence in each reporter?([15])

Comparing this form of presentation with the modern historical methodology, he pays it a high tribute by observing:

This form of historic composition is unique in the case of the Arabs and meets the most essential requirements of modern historiography, namely, "back to the source" and "trace the line of authorities".([16])

Margoliouth, another great Orientalist (editor of a number of valuable Arabic works, and an author of many books), while tracing the beginnings of Arabic history, compares the form of presentation of the Muslims with that of the Greek historians and acknowledges its superiority over their system, as well as over the Christian and Jewish historical as well as religious literature and observes: As we have seen, the Arabic historians render the tracing of sources far easier than those of other nations by the fact their history is a development of Ahadith (the Traditions). It does not begin with either the continuous or the offcial chronicle, but with the narratives of the eye-witnesses. The possession of this system gave the Muslims an obvious advantage in their controversies with Jews and Christians, who gave more the appearance of taking their information on trust. They had no chain of authorities for either sacred or secular history. Where, e.g., the Greek historians are not describing their own experiences, they rarely give us the opportunity of testing the sources of the information which they present; we have to assume that it was obtained from people who knew. Ultimately the Jews had to compose an *isnad* for their Taurah."([17])

It would be enlightening if we examine our above point of view in the light of certain historical works produced by the Muslim scholars.

Ibn Hisham relates, in his *Sira of the Prophet*, the Prophet's grief at the martyrdom of Jafar in the battle of Muta:

Says Ibn Ishaq that Abd Allah ibn Bakr told him, on the authority of Umm-i-Musa al-Khuza iya, on the authority of Umm-i-Ja'far bint Muhammad b. Ja'far b. Ja'far b. Abi Talib, on the authority of her grandmother Asma bint Umais who said....([18])

Jahshiyari in his *Kitab al-Wuzara w-al-Kuttab*, while tracing the causes of the slaughter of the Bermicides at the hands of Harun al-Rashid, prefixes an *Isnad* to the text by saying:"And said 'Ubaid Allah b. Yahyab. Khaqan: I questioned Masrur, the elder, in the days of al-Mutawakkil…about the cause of the murder of Ja'far at

the hands of al-Rashid who said...([19])

Al-Baladhuri gives an account of the Prophet's instructions issued to Amr ibn Hazm, while sending him to al-Yaman, thus:

وحدثنی الحسین قال حدثنی یحییٰ بن آدم قال حدثنا زیاد عن محمد بن اسحاق ان رسول اللہ---([20])

[And al-Husain told me on the authority of Yahya b. Adam, on the authority of Ziyacd on the authority of Muhammad b. Ishaq that the Prophet of Allah....]

A similar style is adopted in their works by Ibn Jarir Tabari, Ibn Athir, Ibn Kathir and other important Muslim historians.

Another way of handling traditions, to which the Muslim historians have sometimes resorted, is that in which the compiler combines diferent traditions into one continuous whole, prefixing a statement of his authorities or contenting himself by interrupting the narrative, wherever need may be, by citing the particular authority.

For instance, al-Baladhuri himself acknowledges in the beginning of his *Futuh al-Buldan*, "I have been informed by certain men learned in tradition, biography and the conquests of lands whose narrative transmitted, abridged and pieced up together into one whole.([21])

A very recent example of traditional method of presentation is to be found in the historical work produced by Shah Wali Allah Muhaddith Dehlavi. In his book *Izalat al-Khafa ‘An Khilafat al-Khulafa*, he is very careful in prefixing *Isnad* to the text.

This application of the method of *Hadith* to historiography by the Muslims has enhanced the value of their works, and has infuenced the modern historical methodology to such an extent that it seems to be an offshoot of the *‘Ilm al-Hadith*.

## References


[1]. Al- Qur'ān, iv, 80

[2]. Ibid., iii, 31

[3]. Ibid., xxxiii, 21

[4]. Khaṭīb Tabrizī, *Mishkāt al-Masābīḥ*

[5]. Ibid

[6]. *History of the Arabs*, London, 1940, p. 393.

[7]. *Encyclopaedia of Islam*, ii, 190-191.

[8]. *Sharh Nukhbat al-Fikar*, UrduTrans. by Muḥammad ‘Abd al-Hayye, Delhi, n.d., p:7.

[9]. James Robson (Tr.), *Mishkāt al-Masābīḥ*, Lahore, 1960, Intro., p. vii.

[10]. Imām Mālik, *Al-Muwaṭṭā*, ed. Fuwad al-Baqi, Egypt, 1951, Kitab al- Ṣalāt al-Jamā'at, p. 129.

[11]. Margoliouth, *Lectures on Arabic Historians*, Calcutta, 1930, p. 56.

[12]. Shaikh ‘Abd al-Haqq, *Muqaddima Mishkāt*, Urdu Trans. Khwaja Muhammad Ali, Lahore, n.d., pp. 58-59.

[13]. Encyclopaedia of Social Sciences, Vol. VII-VIII, p. 381.

[14]. 1bid.

[15]. P.K. Hitti (Tr.), Kitāb Futūh al-Buldān, Vol. 1, Intro., pp. 2-3.

[16]. Ibid., p. 3

[17]. Margoliouth, op. cit., p. 58.

[18]. Cf. Ibn Hishām, *Al-Sīrat al-Nabawiya*.

[19]. Jahshiyarī, *Kitāb al-Wuzarā w-al-Kuttab*, Cairo, 1938, p. 254.

[20]. Al-Balādhurī, *Kitāb Futuḥ al-Buldān*, Cairo, 1319 A.H., p. 77

[21]. Cf. Hitti (Tr.), *Futuḥ al-Buldān*, Vol. I, p. 15.


★★★★★

*Dr. Amanullah Khan

# Early Muslim Historiography

Historiography was among the earliest disciplines cultivated by the Muslims after the advent of Islam. Numerous definitions have been attached to the word history. It would be noted with interest if we give below some definitions from scholars – modern and ancient, Non-Muslims and Muslims:

James Thompson Shotwell observes:

> The word history is used in two senses. It may mean either the record of events or events themselves. Originally limited to inqiry and statement, it was only in comparatively modern times that the meaning of the word was extended to include the phenomena which form or might form their subject…
>
> History in the wider sense is all that has happened, not merely all the phenomena of human life, but those of the natural world as well. It includes everything that undergoes change; and as modern science has shown that there is nothing absolutely static, therefore, the whole universe and every part of it has its history.([1])

Henry Elmer Barnes informs:

> In an objective snese history is to use the words of Professor Robinson, 'all we know about everything man

* Journal of the Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Vol. VIII, No. 4, pp. 1-13, published by Research Society of Pakistan, Lahore, 1973

> has ever done, or thought, or hoped or felt'. Subjectively or psychologically expressed, history may be regarded as a record of all that has occurred within the realm of human consciousness.([2])

Henri Barr and Lucien Febvre remark:

> That in the broadest sense history comprises nature as well as humanity… In its narrower sense – history is the study of change in humanity. The formula that history is the study of human facts of the past although general and perhaps a little vague, excludes no element of history.([3])

Allama Sakhawi (831-902 A.H. / 1427-1497 A.D.) had given a broader view of History long before:

> In sum, the term Tarikh signifies a branch of learning that is concerned with research regarding the occurances which take place in time, in the intention to establish their character and their place in time. In fact, it is concerned with everything that was (and is) in the world.([4])

Earlier, in the first half of the fourth century of Muslim era, Al-Mas'udī (d. 346) commenting on history observed:

> History is a branch of knowledge which is enjoyed by both scholars and ignorant persons and which is relished by both the stupid and the intelligent. Everything remarkable becomes known through history. Every marvel gains its appreciation through it. Noble and sublime character qualities are derived from it. The political education of kings and others is based on it. History collects for you the first and the last (of persons and things), insufficiency and abundance, nomadic life and city life (persons and) things of the past. Many judgments (regarding the moral and legal character of things) are based upon history. The knowledge of it is considered as an asset in any gathering and station.([5]) Al-Mas'udī continues that his incentive to write works on history (tarikh) and world events (akhbar) was the desire to follow the aim which was aspired to and followed after by scholars and sages, and the wish to leave in the world a praise worthy memory and ready, well arranged knowledge.([6])

Ibn Khaldun (d. 1406 A.D.), the great Muslim philosopher, gave new meaning to history:

> History is a discipline widely cultivated among nations and races. It is eagerly sought after. The men in the street, the ordinary people aspire to know it. Kings and leaders vie for it.
>
> Both the learned and the ignorant are able to understand it. For on the surface history is no more than information about political events, dynasties, and occurrences of the remote past, elegantly presented and spiced with proverbs. It serves to entertain large, crowded gatherings and brings to us an understanding of human affairs. (It shows) how changing conditions affected (human affairs), how certain dynasties came to occupy an ever wider space in the world, and how they settled the earth until they heard the call and their time was up.
>
> The inner meaning of history, on the other hand, involves speculation and an attempt to get at the truth, subtle explanation of the causes and origins of existing things, and deep knowledge of the how and why of events. (History), therefore, is firmly rooted in philosophy. It deserves to be accounted a branch of (philosophy).([7])

Talking of the excellence of historiography and critically appreciating the various approaches to history, Ibn Khaldun stated:

> It should be known that history is a discipline that has a great number of (different) approaches. Its useful aspects are very many. Its goal is distinguished. (History) makes us acquainted with the conditions of past nations as they are reflected in their (national) character. It makes us acquainted with the biographies of the Prophets and with the dynasties and policies of the rulers. Whoever so desires may thus achieve the useful result of being able to imitate historical examples in religious and wordly matters. The (writing of history) requires numerous sources and greatly varied knowledge. It also requires a good speculative mind and thoroughness (Possession of these two qualities) leads the historian to the truth and keeps him from slips and errors. If he trusts historical

information in its plain transmitted form and has no clear knowledge of the principles resulting from customs, the fundamental facts of politics, the nature of civilization, or the conditions governing human social organization, and if, further more, he does not evaluate remote or ancient material through comparison with near or contemporary material, he often cannot avoid stumbling and slipping and deviating from the high road of truth.([8])

There is one thread that runs through all definitions. It is accepted that the History is the study of humaa past. This view of History, however, narrower helps to initiate further useful discussion.

In the field of historiography, innumerable Muslim historians made their valuable contribution. Ibn Nadim devotes a long chapter to the studyof historians, Akhbariyyun, Genealogists and Biographers. He opens the discussion with an account of Ziyad. Other historians whose lives and works were reviewed included among others "Ubaid b. Sharyah, ‘Awänah, Muhammad b. Ishāq, Abu Mikhnaf, Ishãq b. Bishr, Al-Zuhri, Muhammad b. Sa'ib al-Kalbi, Hishām al-Kalbi, al-Wãqidi, Muhammad b. Sa'd, Haytham b. 'Adi, al-Madaini, Muhammad b. Habib, Abd al-Hamid, al-Katib, Mus'ab b. Abd Allah al-Zubayri, Zubair b. Bakkär, al-Azraqi, al-Balādhuri, Abu'l Farj al-Ispahāni and al-Jalüdi. ([9])

Al-Mas‘udī has already been mentioned ([10]). The renowned bibliographer Haji Khalifa (1599-l658) made a thorough investigation into the names of the historical works produced by the Muslim scholars. He gives a long list in alphabetical order of one thousand and three hundred such works.([11]) And it is evident that it is not a complete one. It shows the deep interest of Muslims in the field of historiograpny

Recent efforts of reputable orientalists, Wustenfeld and Brokelmann, to collect information about names, lives and works of Arabic historians, show the great interest and industry of the Muslims in this field of learning. Muslim scholars kept themselves engaged in contributing to this noble art. Beginning of Muslim historiography and channels through which it flowed merit attention of scholars.

Many Orientalists([12]) hold that the main influence which

contributed to the developmeat of the Muslim historiography came from the Persian books of history. *Khuda-i-nama*, which was translated into Arabic by Iba al-Muqaffa (d. 757) under the title Siyar al-Mulük al-Ajam,([13]) has been specially mentioned. But this opinion can be revised in the light of comments of Franz Rosenthal. In his book, A History of Muslim Historiography, he states:

> The available evidence as to the form of Iranian historiography in the seventh century is very slim. This much, however, seems certain: There is nothing that would permit us to assume that the Persians used an annalistic arrangement. Everything tends to show that they did not, and there is the additional theoretical consideration that the absence of a continuous era would have made the compilation of a long-range historical works a difficult task. All those who preferred to stress the predominance of Persian inâvence upon the origins of Muslim historiography failed to give proof that simultaneously with dynastical historio graphy also the annalistic form was introduced under Persian infuence, In fact, this cannot have been the case([14]).

He elucidates his point further:

> Even supposing that the Hwataynamak and similar products of Sasanian historiography were based upon official annals, that would not mean that the historical works were written in annalistic form... According to the Arabic versions of Hwataynamak, the only data contained in it concerned the length of the Teigns of the individual rulers.([15])

In fact Muslim historiography began and developed under different influences semi historical, historical, and religious. Among these, the influence of Islam was dominant. These could be taken up individually. This will help to assess their impact on the Muslims historiography.

## Pre-Islamic History

Professor Morgoliouth has discussed this aspect:

> That Arabic history owes nothing to Greek history and

> little if anything to Persian history, seems clear ; but it also appears to be independent of pre-Islamic Arabian chronicles.([16])

Professor Hitti adopts the same line:

> Although rudementary elements of historiography can be traced back to the descriptions of the "days", i.e., the battles between the tribes and such stories as the "Ma'ribdam", "the owners of the elephant", and the digging of the zamzam well-all of pre-Islamic antiquity-yet Arabic historical writing, in the strict sense of the term, is a branch of Islamic literature".([17]) The writer on the other hand, of the Articles on Tarikh in the Urdu Encyclopaedia of Islam, has tried to trace the influence of pre Islamic inscriptions, oral and tribal traditions on the beginning and development of the writing of History among the Muslims.([18])

It is a fact that in southern Arabia, especially in Yemen, the cradle of ancient culture and civilization, there were many inscriptions. Some of them survived the destructive hand of ages. These inscriptions tell the name of the kings of those regions and the stories related to them. They depicted imperfect, but comparatively less exaggerated picture of the century preceding Islam. In the words of Morgoliouth:

> We may call many of the inscriptions historical records, though normally the form which they take is to give the reason why some votive offering was presented to a god. Such inscriptions commence with the name or names of the donors and an accouunt or list of the services whereby the deity had earned such a gift.([19])

The infuence of inscrsiptions is further explained:

> Pcople used to tell stories about their past in an exaggerated form. These stories were transmitted through oral tradition to the Muslims of the first century of their era, who with the help of their imagination developed such stories further and continued transmitting those to the succeeding generations, who continued considering such stories as ancient history. "Ubaid b. Sharyah and Wahab b. Munabbih gave place to such stories in their works and the

former was among the authorities of Ibn Ishaq. Thus this infuence crept into the works of later historians and affected the development of critical outlook and obstructed in the way of understanding ancient history.([20])

This discussion encourages further explanation:

(a) That such inscriptions had little attraction for the Muslims; for, what these inscriptions record directly is not tribal or national history, but the record of service rendered by a fictitious deity, rewarded by a pagan rite. The very names of deities and offering of images were sufficient to evoke dislike in the minds of the Muslim Arabs.

(b) No doubt, ‘Ubaid b. Sharyah on the orders of Haḍrat Amir Mu‘īwiyah wrote'Kitāb al-Amthāl and Kitāb al-Mulūk wa'l Akhbār al-Madiyyun'([21]) and Wahab ibn Munabbih composed 'Kitāb al-Mubtada’([22]), but these works are not before us to see how they utilized the oral tradition-whether or not they accepted that with criticism.

(c) Arabic historians in general seem to be very cautious in accepting ancient history. Even in the first century of their era they had under the infuence of Islamic teachings in general and under the injunctions of the Qur’ān and Hadith in particular, developed an excellent critical outlook. Especially the Science of Tradition had contributed much to the cause of history by furnishing the Muslim historian with a science of criticism, which he applied to every aspect of the field.

(d) If, at all, the above influence, through certain sources, crept into the sphere of Muslim historiography, it is so insignificant that it does not merit attention.

The pre-Islamic Arabian influence of Northern regions made some inroads in the sphere of expression. The method of narrating the tribal traditions and the geneology could not remain uninfluenced.

The Arabs of this region had their tribal traditions. For preserving them, their memories served as archives. These traditions were mostly in the form of poetry. On certain occasions, prose was also used. The mode of expression was inherited by the Muslim Arabs. Historians narrated the major events in the poetic

form. It was easier system of history writing for the Arabs, who even after the advent of Islam, continued to live in a semi-tribal set up.

Another infuence though less conspicuous, came from the pagan Arabs. It was Ansāb. The Arabs had developed deep interest in preserving their genealogies from the early times. Respect and dignity were based on descent. The study of genealogy received new impetus when Hadrat Umar b. al-Khattāb introduced the system of Atã. The task of assigning state pensions required careful scrutiny of the genealogical relationship of each Muslim Arab. His kinship to the Holy Prophet (peace be upon him) and his precedence in accepting Islam determined the quantum of pension.

## Religious Influence

The preservation of the Qur'ān and the Hadith were the chief aims of the Muslims. This mission shaped the historical outlook of the Muslims. All other considerations were only secondary.

In the introduction to the History of Malaqah (Malaga), Abu Bakr Muhammad b. Muhammad b. Ali b. Khamis (d. after 636 A.H./ 1239 A.D.) emphasised the importance attached by the Muslims to the study of history.

> Next to the Qur'ān and the Sunnah, the most deserving subjects of assiduous study are history and biography. They serve to remind (man) of the fact that time turns its children up and down. They show the remarkable events (anba) which happened in former times. They call attention to the (religious) scholars whose activities must be followed and whose qualities and stories (akhbar) must be written down. Those scholars will thus be (as) familiar to you, as if they were standing before you together with other (living) men, were in contact with you and spoke to you, and were shown to be exactly as they are said to be. Those who never saw them personally will read their marks. Those whose age did not permit them to see them will witness their good actions. Their rank and position will thus be known. It will be known who among them was conversant with the knowledge acquired through tradition and understanding and who excelled in the knowledge acquired through observation and through

> books. It will become clear who was well educated and equipped for leadership. Great zeal will be displayed in order to reach them and share their status.([23])

Allāma Iqbal the great poet philosopher also shares with other Muslim scholars, when he attaches an immense importance to the study of history for the growth of Muslim community.([24])

In fact, the Holy Qur'ān has laid emphasis on history as a realistic and purposeful account of facts of human experience. Allah has said this in the Qur'ān:

> لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُوْلِي ٱلْأَلْبَٰبِۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ ٱلَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ([25])

> In their history verily their is a lesson for men of understanding. It is no invented story but a confirmation of the existing (scripture) and a detailed explanation of every thing, and a guidance and a mercy for folk who believe.

A practical incentive for the study of history came from the fact that the Qur'ān contains abundant historical data. The Qur'ān tells past events. There is a detailed information about the people of Nūh, Hūd, Madyan and Thamūd. It gives the narratives of the Prophets Mūsā and Härün (peace ba upon them) and about Fir'awn and Qårün, about Ashab al-Kahf and about Namrüd and about the Prophets Ibrähim, Ya'qüb, Yūsūf, Dāwüd, Sulaimān, 'Isā (peace be upon them). These narratives convey moral lessons. Through them the likes and dislikes of Allah the Almighty are told. Avoiding the dislikes and following the likes were the ways towards human good. In fact, the Muslims got their historical realism due to these records of the past.

As the art of Tafsir developed among the Muslims, the Qur'ān interpreters were forced by the above circumstances to look for illustrative historical information. In the course of time, the occupation with the historical material of the Qur'ān came to be considered one of the branches of learning that were developed in connection with the Qur'ān.

The Qur'ān infuses in its followers with enthusiasm to

preserve the events of the contemporary history. Predictability is an important feature of the study of history. The Qur'ān gives us the guideline in this respect:

غُلِبَتِ ٱلرُّومُ o فِيٓ أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ وَهُم مِّنۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُونَ o فِي بِضۡعِ سِنِينَۗ لِلَّهِ ٱلۡأَمۡرُ مِن قَبۡلُ وَمِنۢ بَعۡدُۚ وَيَوۡمَئِذٖ يَفۡرَحُ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ o بِنَصۡرِ ٱللَّهِۚ يَنصُرُ مَن يَشَآءُۖ وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ ([26])

The Romans have been defeated in the nearer land and they, after their defeat will be victorious within ten years-- Allah's is the command in the former case and in the latter and on that day believers will rejoice. In the Allah's help to victory. He helpeth to victory whom He will. He is the Mighty, the Merciful.

Moreover, many events concerning the life and times of the Holy Prophet (peace be upon him) are enunicated in this Holy Book. These events very soon became historical happenings of supreme significance to the Muslims, and stimulated historical research.

The most Gracious and Merciful Allah gives an idea of the science of time reckoning to his believers by revealing:

وَجَعَلۡنَا ٱلَّيۡلَ وَٱلنَّهَارَ ءَايَتَيۡنِۖ فَمَحَوۡنَآ ءَايَةَ ٱلَّيۡلِ وَجَعَلۡنَآ ءَايَةَ ٱلنَّهَارِ مُبۡصِرَةٗ لِّتَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡ وَلِتَعۡلَمُواْ عَدَدَ ٱلسِّنِينَ وَٱلۡحِسَابَۚ وَكُلَّ شَيۡءٖ فَصَّلۡنَٰهُ تَفۡصِيلٗا ([27])

We made night and day two signs. We darkened the sign of the night, and We made the sign of the day luminous, so that you might desire excellence from your God and know the computation of years and (the science of time) reckoning. And everything we have expalined with a detailed explanation.

Again He reveals:

يَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡأَهِلَّةِۖ قُلۡ هِيَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَٱلۡحَجِّۗ ([28])

They ask thee about the new moons. Say, They are means for measuring time for (the general good of) mankind and for the Pilgrimage.

At another place we find:

هُوَ ٱلَّذِي جَعَلَ ٱلشَّمۡسَ ضِيَآءٗ وَٱلۡقَمَرَ نُورٗا وَقَدَّرَهُۥ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُواْ
عَدَدَ ٱلسِّنِينَ وَٱلۡحِسَابَۚ مَا خَلَقَ ٱللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِٱلۡحَقِّۚ يُفَصِّلُ
ٱلۡأٓيَٰتِ لِقَوۡمٖ يَعۡلَمُونَ o إِنَّ فِي ٱخۡتِلَٰفِ ٱلَّيۡلِ وَٱلنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ ٱللَّهُ فِي
ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ لَأٓيَٰتٖ لِّقَوۡمٖ يَتَّقُونَ([29])

It is He Who made the sun a "luminary", and the moon a light, and ordained for it stages, that you might know the number of years and reckoning (of time). Allah only created that for a good reason establishing distinct signs for people who have knowledge. Surely in the variation of the night and the day, and that which Allah has created in the heavens and the earth, there are signs for people who keep their duty.

The Qur’ānic injunctions were followed when annalistic fixation of history took place during the caliphate of Hadrat Umar ibn al-Khattäb. He invented the Islamic Era.

Professor Morgoliouth says in this connection:

...We note certain mcthods devised by the Arabic historians for ensuring accuracy in the record of events. One is dating them by the year and month, and even the day. The historian of civilization, Buckle, states that this practice in Europe is not earlier than 1597 A. D. Among Arab historians we find it developed in Tabari and an earlier author al-Haitham b. Adi, born 130 A. H., is credited with a history arranged in order of years. For such a purpose an era was necessary, and it is asserted that the practice of dating by the Prophet's Hijrah was introduced by the second caliph.([30])

The Muslims took keen interest in the personality and teachings of the Holy Prophet Muhammad (peace be upon him). The compilation of traditions relating to his life, activities, and teachings became their chief concern. This task also coloured their historical outlook.

The scholars who devoted themselves to this stupendous work were described as *Muhaddithun*. From amongst them arose

another class known as Akhbāriyyūn, genealogists and writers of the campaigns of the Prophet (peace be upon him) who were later on identified as historians. The works on Traditions were different from those written on Siyar (biography) and campaigas of the Prophet (peace be upon bim). Historical method was first of all introduced and applied at a large scale to the works composed on biography and campaigns (Siyar and Maghāzī). This is correct in the light of the evidence of the earliest works. They are in the form of biogra phies, books of conquests, genealogies and classified sketches (ṭabaqāt) of Traditionists. A rare attempt was also made by a Yamanite story-teller ‘Ubaid b. Sharyah([31]), who composed for caliph Mu'awiyah (661-80) number of works dealing with the ancient history of South Arabia. But the presentation was weak and failed to attract the Arabs.

The domains of Siyar and Maghãzī in their carlier phases overlapped and were not distinctly delimitated. The works generally included events relating to the life of the Prophet, his activities, and the accounts of his battles, etc.

The caliph ‘Umar bin ‘Abd al‘Azīz gave special attention to the science of Maghāzī and issued orders that separate study circles should be set up for the writing of the battles of the Holy Prophet. He also ordered ‘Āsim b. Qatādah Ansārī (d 120 AH or 104, 119, 127, 129), who was a specialist in this science to give lessons to the people in the congregational Mosque of Damascus on Maghāzī and Manāqib.([32])

About the same time, Imām Zuhrī wrote an independent work on Maghāzī and it was the first book in this subject([33]). It was due to Imam Ẓuhrī that the interest in Maghāzī and Sira was augumented. His school produced many persons who were experts in this art.

Of the pupils of Imäm Zuhri, Mūsā b. ‘Uqbah (d. 141 AH), acquired a great reputation. Imām Mālik was Musa's pupil in Ḥadith and was his great admirer. He used to tell people in persuasive discourses to learn Maghāzi from him if they really had liking for it. His works showed a special care in verifying the authenticity of the traditions and he had the general affection for giving details. His works, therefore, could he considered as comprehensive histories.

[The discussion in this article provides vital information for the understanding of the subsequent Muslim Historiography. Whatever was written in the realm, it showed a deep imprint of the early era. It would be rather correct to assume that the subsequent Muslim historiography is incomprehensible without a real awareness of the knowledge of the early Muslim historiography. This, indeed, is true of the present and the past historiographical cfforts of the Muslims of Pakistan. Editor.]

## References


[1]. Encyclopaedia Britannica (Ed. 1961), xi, p. 594

[2]. Encyclopedia Americana (1949), xiv, p. 205

[3]. Encyclopedia of Social Sciences (1950), vii-viii, p. 358

[4]. Al-Sakhawi, I'lān, Eng. Tr. F. Rosenthal I'lān History of Muslim Historiography (Leiden, 1952), p. 205.

[5]. Ibid, p. 222

[6]. Ibid, p. 222

[7]. Ibn Khaldūn, The Muqaddimah, Eng. Tr., Franz Rosenthal (New York, 1958), i, p. 6.

[8]. Ibn Khaldūn, op. cit; pp. 15-16

[9]. Cf. Al-Fehrist, (Leipzig, 1871), pp. 137-73.

[10]. See definitions.

[11]. Cf. Kashf al- Ẓunūn (Istanbul, 1941-43), 1, pp. 271-333.

[12]. Urdu Encyclopaedia of Islam (Labore, 1959), iv, Fas. 1, p. 47.

[13]. Cf. Encyclopedia of Soclal Sciences, Articles on History and Historiography, Vol. 7-8, p. 382.

[14]. Rosenthal, Muslim Historiography, p. 66.

[15]. Ibid., p. 66

[16]. Lectures on Arabic Historians (Calcutta, 1930), p. 22.

[17]. Futūh al-Buldän, Eng. Tr. (New York, 1916), Intro. p. 1.

[18]. Cf. Vol. 4, Fas. I, pp. 47-49.

[19]. Lectures, p. 28

[20]. Cf. Urdu Encyclopaedia of Islam, iv, Fas i, p. 47.

[21]. Cf. Al-Fehrist, p. 132

[22]. lbid., p. 138

[23]. A1-Sakhāwī, ‘Ilān, Eng. Tr. op. cit, p. 232.

[24]. Cf. Rumüz -i- Bikhudī (Lahore, 1954), pp. 169-73.

[25]. Al-Qur’ān, 12: 111

[26]. Al-Qur'ān, 30: 2-5

[27]. Al-Qur’ān, 17:12

[28]. Al-Qur’ān, 2: 189

[29]. lbid, 10: 5

[30]. Lectures, pp. 17-18

[31]. Al-Fehrist, p. 132.

[32]. Ibn Ḥajar al‘Asqalānī, Tahdhīb al-Tahdhīb (Hyderabad Daccan, 1326 AH), v, pp. 53-54.

[33]. Shiblī Nu'mānī, Sīrat al-Nabī (5th Ed. Lahore), i. p. 21.

★★★★★

*Dr. Amanullah Khan

# Al-Wāqidī – An Assessment of His Position as an Historian

Abu Abd Allah Muhammad b. Umar b. Waqid al-Waqidi, a renowned scholar of the second Century of Muslim Era, was a native of Madina. Information about his life, activities and works, and about his position as a Traditionist and an Historian, can be collected from such sources as:

Tabaqat([1]), al-Ma'arif([2]), Fihrist([3]), Ta'rikh Baghdad([4]), Mu'jam al-Udaba([5]), Wafyat al-Ayan([6]), Mizan-al. I'tidal([7]), Tahdhib al-Tahdhib([8]), Tarikh adab al-Lughat al-Arabiyya([9]), Lectures on Arabic Historians([10]), Encyclopaedia of Islam([11]), the monthly Ma'arif([12]), and G.A.L.([13]), etc.

Al-Waqidi was born in the year 13o A.H. He was so called after his grand father al-Waqid; and he was called al-Aslami as he was a *mawla* of 'Abd Allah b. Buraida who belonged to the Medinite family of Aslam- a descendant of Salim. Al-Waqidi was a very industrious student and was interested in different branches of learning. In order to quench his thirst for knowledge he would go to the renowned and erudite scholars of his time. The list of his teachers includes such important persons as Imam Malik b. Anas, Sufyan al-Thauri, Abu Ma'shar, Ibn Abi Zi'l, 'Umar b. Rashid, Rabiah b. Uthman and Muhammad b. Tjlan, etc. Ibn Juraij, who is associated with the commencement of the study of Tradition, was

* Chairman (R), Department of Islamic Studies, University of the Punjab, Lahore

also among his teachers.

Likewise, the list of his pupils, who delivered traditional information on his authority, includes a nunmber of distinguished luminaries of his time, like his secretary Muhammad b. Sa'd, Abu Hasan al-Ziyadi, Muhammad b. Ishaq-al-Sughani, Abd Allah b. al-Hassan al-Hashmi and Harithb. Osama, etc. Imam Shafi"i, Abu Ubaid al Qasim b. Sallam and Muhammad b. Yahya al-Azdi have also conveyed information on his authority.

The range of al-Waqidi's studies coverd Tafsir, Hadith, Jurisprudence, Genealogy and History. A special attention was paid by him to History in which he acquired the greatest skill and fame. By the year 170 A.H. he had become a prominent figure among the Medinese scholars of repute. It was mostly due to his erudition and skill in History that he, on the occasion of Harun al-Rashid's pilgrimage in the above year, was recommended to him as the best authority on the holy places of his native town. So he acted as a guide to the Caliph and his most benevolent *vizier* Yahya b. Khalid, when they visited the sacred places.

Khatib Baghdadi tells us how al-Waqidi, in 180 A.H. when he met with the financial difficulties, paid his first visit to Baghdad. There at first he went to the residence of Yahya b. Khalid and called on him. He was kindly received by that great vizier who gave him rich gifts and provided him with abundant money to repay his debts. He also provided him with a furnished house to live in; and when al-Waqidi requested him to allow him to go back for a time to Madina for paying off his debts, he made arrangements for his journey. On al-Waqidi's return to Baghdad, he was once again warmly received by Yahya and this time was presented to Harun al-Rashid at Rakka where he was holding his court. The Caliph recalled with pleasure his visit to Madina and gave him rich gifts.([14])

Yaqut al-Hamavi conveys us the information of al-Waqidi's being appointed by Harun, judge of the Eastern quarter of Baghdad.([15]) But J. Horovitz criticises the statement of Yaqut by saying, The older sources make no reference to his receiving from Harun the office of Kadi of the castern quarter of Baghdad, the story first appears in Yaqut, Udaba, VII, 56 without a source being given".([16]) We may solve this puzzle by referring to Khatib Baghdadi and lbn Hajar al-Asqalani. Khatib says in this

connection:

قدم الواقدی بغداد و ولی القضاء الجانب الشرقی فیھا۔([17])

> Al-Waqidi entered Baghdad and he was appointed *Qadi* of the eastern quarters of the City.

Ibn Hajar makes it more clear by giving a statement on the authority of Ahmad b. Mansur al-Rimadi. He says:

وقال احمد ابن منصور الرمادی: قدم علینا علی بن المدینی بغداد سنة سبع اوثمان وثمانین قال: والواقدی قاض علینا۔([18])

> Says Ahmad b. Mansur al Rimadi: Ali b. al Madini came to us in Baghdad in the year 87 or 88 (i.e., 187 or 188 A.H., when Harun al-Rashid was still in the seat of Caliphate); and he said further that at the time al-Waqidi was working as our *Qadi*.

From the above statement it is quite evident that al-Waqidi worked as a *Qadi* of Baghdad in the Caliphate of Harun al-Rashid. And it is quite clear that he was appointed Qadi by no other person than Harun himself.

Afterwards in the Caliphate of Mamun-al-Rashid he was appointed Qadi of Askar-al-Mahdi (Al- Mahdi's camp) in Rusafa which position he held till his death.

Both the Abbasid Caliphs, Harun and Mamun, and the Bermicide vizier Yahya held Waqidi in very high esteem. They met his demands, bestowed their favours upon him and provided him with facilities. *Khatib* tells us an anecdote of considerable interest which depicts the very good nature of al-Waqidi and at the same time shows his close relations with Mamun. He says, Al-Waqidi wrote to the Caliph complaining of some difficulty which had compelled him to run into debt, mentioning the amount, Mamun replied on the reverse of the letter received by him. You have, I see, two qualities, munificence and modesty: the former has caused you to deal lavishly with your possessions, the latter has induced you to mention to us only part of the debt which you have incurred. And we have ordered such and such amount for you. If we have fulfilled your request, then practise even grcater liberality than before, for the treasuries of God are open, and His hand is stretched out in munificence, You yourself reported to me

when you were al-Rashid's judge that the Prophet said to al-Zubair: The keys of wealth are in front of the Throne, and God Al-Mighty sends down to mankind their provision according to their expenditure, whoso spends much will receive much, and who so spends little receives little. Waqidi stated that he had forgotten that tradition, and was more rejoiced at Mamun's reminding him of it than by his gift.([19])

**His Faith**

Al-Waqidi is described by Ibn al-Nadim a Shiite of the moderate school. He says:

وكان يتشيع حسن المذهب۔ ([20])

We are further told by him that he considered the practice of Taqiyya to be lawful.

يلزم التقيه۔ ([21])

And it is also to be found in the Fihrist:

وهو الذى روى ان عليا عليه السلام كان من معجزات النبى صلى الله عليه وسلم كالعصا لموسى عليه السلام واحياء الموتى لعيسىٰ بن مريم عليه السلام۔([22])

That he transmitted the statement that Ali (Peace Be Upon Him) was one of the Miraculous signs of the Prophet (Peace Be Upon Him) like the rod of Musa (Peace Be Upon Him) and the revival of the dead by Isa Ibn Maryam (Peace Be Upon Him).

J. Horovitz also holds the same opinion as is professed by Ibn-al-Nadim, and according to his view al-Waqidi had a great inclination for Shi‘ite tendencies and he practised *taqiyya* even in his *kitab al-Maghazi*. He says: When we are further told in the *Fehrist* that Wakidi also studied takiya([23]) (Yalzamu'l takiya) this is in keeping with his point of view in the Kitab al-Maghazi; for there Ali's name is not mentioned in several accounts of events in which lbn Ishak expressly mentions his participation and Wakidi did not suppress traditions hostile to Ali....On the other hand, the very title of the monograph Mawlid al-Hasan wa'l Hussain (see above) reveals a Shi‘i attitude-a non-Shi'i would hardly have dealt with this subject-and the zeal for Ali is also seen in the fact that

Wakidi collects a great deal of evidence of Muhammad's having died in Ali's bosom...([24])

But it is remarkable to note that the same biographer of Waqidi, after arriving at the above conclusion, says: The story in the Fihrist seems, however, to be isolated and the Shi'i rijal books do not quote Wakidi.([25])

**His Death**

Al-Waqidi died at Baghdad in the year 207 AH, while he had reached the 78th year of his age. He was burried in the Khaizuran cemetery and the funeral service was conducted by Muhammad b. Samma'ah al-Tamimi.([26]) Such a munificent person was he that when he died, even shroud cloth could not be found in his house to cover his body. Al-Mamun became aware of the fact, and he made arrangements for his funeral.([27])

**His Works**

The list of Waqidi's works is lengthy and varied, and is to be found in the Fihrista([28]) and Mu'jam-al-Udaba,([29]) etc. Mostly his works are of historical nature and they cover the early history of Makka and Madina as well as the Muslim period. From the titles of the works several of which are monograph types-it is gathered that Waqidi favoured that style which was favourcd by al-Mada'ini. Like al-Mada'ini he has composed monographs on special incidents in the history of Islam such as "Wafat al-Nabi," "al Saqifa wa-Ba'iat Abu Bakr", "Siffin," "al-Jamal", "Maqtal al-Hussain" and "al-Ridda", etc. But he is considered to be a more serious personage than either Mada'ini or Hisham al-Kalbi.([30]) Three of al-Waqidi's compositions seem to be very comprehensive books on the early history of Islam. One is his "al-Ta'rikh al-Kabir" (the Great History), the other is "al-Tabaqat" which is the foundation of the Tabaqat of Ibn Sa'd, and the third is his "al-Ta'rikh wa'l Maghazi wa'1 Mab'ath," it., an account of the Prophet's mission and his campaigns. Some of the titles of his other works are:

Akhbar Makka", "Futuh-al-Sham," *"Futuh al-Iraq"*, "*Harb al-Aus wa'l khazraj"*, "Amr al-Habsha wa'l-Fil", "'al-Sira", "Azwaj al-Nabi", *"Sirat Abu Bakar wa Wafatuhu"*, "Mawlid al-Hassan wa'l Hussain," Darb al-Dananir Wal-Darahim" and Tarikh al-Fuqaha", etc.

According to Margoliouth the only work of al-Waqidi which has seen the light of the day is a part of his *Maghazi*, published in Calcutta, and a translation in German of a fuller Ms. preserved in the British Museum.([31]) A photostat copy of the above manuscript is also found in the library of the Punjab University, Lahore. Jurji Zaydan gives the following titles of his published works:

1. Kitab al-Maghazi.
2. Futuh al-Sham
3. Fath Ifriqiyyah
4. Fath al-Ajam
5. Fath Misr wa'l Iskandriya

and a number of books on conquest like Fath Minaf wa'l Jazirah, etc. A manuscript copy of his *"Tafsir al-Qur'an"* is also to be found.([32])

But according to Margoliouth and Horovitz, the *Futuh al-Sham* and *Futuh al-Iraq* have not been preserved; the books which go under these names belong to a later date and have been credited to Wakidi.([33])

**His Evaluation:**

Al-Waqidi has been a very controversial figure with the Muslim scholars of repute. While some recognize him as an authority in the field of Hadith and History, others reject him for Hadith proper. Khatib Baghdadi, Ibn Hajar Asqalani and Allama Dhahabi have collected the verdicts of different luminaries, both favourable and unfavourable to him. Among his admirers and supporters are persons like Drawardi, Yaqub b. Shaiba, Mus'ab Zubairi, Ibn Numair, Yazid b. Harun and al-Baladhuri's teacher Abu Ubaid al-Qasim b. Sallam, etc. And those who do not accept him as an authority in the matters of Hadith and who doubt his reliability are: Imam Bukhari, Imam Nisai, Imam Shafi'i, Ibn al-Madini, Imam Ahmad b. Hanbal, Yabya b. Muin, Imam Abu Daud, Abu Hatim and Imam Darqutni, etc. Imam Dhahabi says in "Mizan al-I'tidal"

استقر الاجماع علی وھن الواقدی۔([34])

There is consensus of opinion on the weakness of al-Waqidi.

This side of the critics of Waqidi is very strong and it includes the Imams of the Science of Tradition. So we are constrained to

say that in the matters of Hadith, al-Waqidi is not to be relied upon. But in the field of history he is to be recognized as an authority. In history he has been quoted and relied upon by such important historians as Tabari, Ibn Sa'd and al-Baladhuri. Even certain Imams, as we will see in the course of our discussion, have collected historical information from him and have considered him to be the most authentic source on history. Aftergiving an account of the favourable remarks passed about him by the different scholars, Yaqut says:

وهو مع ذالک ضعفه طائفة من المحدثین۔۔۔ اما فی اخبار الناس والسیر والفقه وسائر الفنون فهو ثقة باجماع۔ [35]

With all this (praise) he has also been criticized and termed as *Da'if* (reporter) by a section of traditionists... But in the matters concerning History, Biography, Fiqh and all other branches of learning, he is reliable unanimously.

Khatib Baghdadi pays bim a tribute in the following glowing words:

قدم الواقدی بغداد و ولی القضاء الجانب الشرقی، وهو من طبق شرق الارض وغربہا ذکره، ولم یخف علی احد عرف اخبار الناس امره، وسارت الرکبان بکتبه فی فنون العلم من المغازی والسیر، والطبقات واخبار النبی صلی الله علیه وسلم والاحداث التی کانت فی وقته وبعد وفاته صلی الله علیه وسلم وکتب الفقه، واختلاف الناس فی الحدیث، وغیر ذالک، وکان جواداً کریما مشہوراً بالسخا۔ [36]

Al-Waqidi entered Baghdad, and he was appointed *Qadi* of the Eastern quarters of the city. He is one of those persons whose reputation has reached the four corners of the world. His personality is known to all, those persons who know about the history of people. The riders have spread (in the world) with his books on *Maghazi*, Biography, *Tabaqat, Akhbar al Nabi*, on the events which occured in the Prophet's life and after his death; and with his works on *Fiqh* and the differences of people in *Hadith*

etc. And he was a munificent and noble person and was famous for his generosity.

From the study of Tarikh Baghdad we come to know that al-Waqidi was very careful in collecting information for his historical works. He would go and personally inspect the places of the battles of the Prophet, and would have information only from the most reliable persons.([37]) God, the most Merciful Lord, had given him a very sharp memory. Yaqut gives an account of the size of Waqid's library. When he moved from the Western to the Eastern side of Baghdad, his books formed 120 camel loads: for al1 that he boasted that whereas other people possessed more books than was stored in their memories, in his case the contents of his memory were the more copious. He says thus:

وروى ابن سعد عن الواقدى انه قال۔ ما من احد الا وكتبه اكثر من حفظه وحفظى اكثر من كتبى و قال يعقوب بن شيبه لما تحول الواقدى من الجانب الغربى يقال۔ انه حمل كتبه على عشرين ومائة وقر وقيل كان له ستمائة قمطر كتب۔([38])

It was perhaps due to his erudition, sharp memory and carefulness that he was held in very high esteems by the great Imam Malik, and he was consulted by the Imam in the matters concerning history. Khatib records an anecdote wherein the said Imam is shown collecting information from al-Waqidi and he is depicted using praiseworthy words for him. Khatib proceeds thus

سُئل مالک بن انس عن المرأة التى سمت النبى صلى الله عليه وسلم بخيبر ما فعل بها، فقال ليس عندى بها علم، وسأسل اهل العلم، فقال فلقى الواقدى فقال۔ يا ابا عبد الله ما فعل النبى صلى الله عليه وسلم بالمرأة التى سمته بخيبر۔ فقال الذى عندنا انه قتلها، فقال مالک قد سألت اهل العلم فاخبرونى انه قتلها۔([39])

Imam Malik b. Anas was asked as to what treatment was extended to that woman who poisoned the holy Prophet (Peace be upon him) in Khyber. He expressed his ignorance about the matter and told that he would collect information about it from the learned men. Afterwards, he

met Waqidi and said 'O' Abu Abd Allah! What the holy Prophet did with that woman who poisoned him in Khyber. The reply was that she was got killed. Now Malik said (to the enquirers): I have collected information from the learned men and the information is that she was killed.

European scholars hold him very high and consider him an authority of first order on carly Muslim history. His special attention to chronology has won him praise from them, and has made his work much valuable. J. Horovitz says, Wakidi's merit lies mainly in his transmission of a very large amount of material and in fixing its chronology.([40]) His particular style, as is seen in his *Kitab al Maghazi*, that is, assimilating the different stories together so as to reproduce them as a comprehensive whole and prefixing the list of his authorities in the beginning of the book and sometimes in the beginning of cach chapter, has also made him favourable in the eyes of modern scholars of history. Though this was a style already adopted by Imam Zuhri and Ibn Ishaq, yet it was a cause of criticism of the traditionists who pay the highest attention to the chain of authorities for each event and each saying. This very style, though in an improved form, was afterwards adopted by al-Baladhuri in his *Futuh al-Buldan*. Even then J. Horovitz complains that Wakidi's work is of a style adopted in the works on *Hadith*. He says, "In Wakidi also the traditions either separately or digested into one record follow one another without being linked up together just as in works on Hadith, but quite contrary to the method of Ibn Ishaq who gives them great cohesion by adding a connecting text.([41])

***Kitab al-Maghazi*:**

The manuscript contained in the British Museum, a photostat copy of which is also to be found in the Punjab University Library, comprises 252 folios, i.e., 504 pages. In the very beginning of the work we find a list of al-Waqidi's authorities from whom he collected traditional as well as historical information. Many of the authorities, quoted by Waqidi, like Imam Zuhri, Musa b. Uqba and Abu Ma'shar, etc., had themselves composed works on *Maghazi*. The list comprises entirely the names of well-known and well-informed scholars. Sometimes in the beginning of the new chapters of his book Waqidi also gives the names of his other reporters. And sometimes he prefixes a chain of reporters to the

most important information.

The book, as appears from its title, deals with the campaigns of the Prophet (Peace Be Upon Him) and it throws no light on the Prophet's life at Makka and his Hijra, After giving the names of different battles of the Prophet and the expeditions despatched by him, and fixing their dates, Al-Waqidi goes on giving a detailed account of those battles and expeditions. He discusses in fullest details the battles of Badr, Uhad and Khandaq, the pact of Hudaibiya, the battles of Khaiber and Mu'ta, the grand Victory of Makka, the battles of Hunain, Ta'if and Tabuk, etc. and throws light on almost all other battles and expeditions. Banu Nadir, Banu Quraiza and Fadak, etc. He also sheds light on the He has also discussed the affairs of acceptance of Islam by Amr Ibn-al-As and on the Hajj of Abu Bakr, known as Hajj-Akbar in the history of Islam. A very detailed description of the Hijjat al Wada', the last sermon of the Prophet-a gist of his teachings and his last words-are also to be found in the book. The book ends with a mention of the preparations which were being made for the despatch of the Muslim army under Usama b. Zaid in the year 11 A.H. Throughout his work it is seen that he is very careful in fixing the dates of each event and each battle. Before giving an account of each battle he would definitely fix its date and year. It is remarkable to note that he has furnished us with the minutest details of the important battles of the Prophet. He would give the names of the participants, would throw light on the preparations made, and would draw a scene of the battle field bcfore our eyes. He would also discuss the treatment extended to the prisoners and would mention about the division of the bounties. Moreover, he would bring to light the difference of opinions of the companions of the Prophet on certain matters and the verdicts of the holy Prophet in that connection.

His interest in the holy Qur'an, Hadith and Fiqh is seen throughout his work. He quotes verses of the Qur'an revealed in connection with diferent battles, thus he discusses Sura Al-Anfal in connection with the battle of Badr and tells us what was revealed in the Holy Qur'an about Uhad, Banu Nadir, the battle of Khandaq and the battle of Tabuk, etc. It is remarkable to note that he closes his book even with a Qur'anic verse by which Hadrat Abu Bakr argued that the despatch of Usama b. Zaid's army was essential.

He also uses poetry, as was a general practice in those days, as a vehicle of history and quotes poetical couplets in making the narrative more comprehensive. But unlike Ibn Ishaq, he does not make a very extensive use of it.

It is strange to note that Waqidi neither includes Ibn Ishaq among authorities, nor quotes in his work, his remarkable work on Maghazi. Harovitz has tried to solve this problem by saying: ....Wakidi never mentions by name his most celcbrated predecessor in the field of biography of the Prophet, Muhammad b. Ishaq. This is all the more remarkable as he not only (in Tabari, III, 2512) passes a very favourable verdict on him but undoubtedly made very great use of his book and obviously follows him in the arrangement of the material...; he possibly wished to coneal his indebtedness by not mentioning the name of Ibn Ishaq.([42])

We may conclude with the words that the importance of this work as a valuable source of the Prophet's campaigns and his life at Madina and the Muslim History during the Prophet's time is very great.

## References

[1]. Ib Sa'd (Leiden, 1918), VII, Pt. II, p. 77

[2]. Ibn Qutaiba (Egypt, 1934), p. 226.

[3]. Ibn A1-Nadim, pp. 144-145.

[4]. Khatib, III, pp. 3-20.

[5]. Yaqut, XVIL, pp. 227-282.

[6]. Ibn Khallikan, I1, pp. 83-85.

[7]. Dhahabi (Lucknow, N.S.), II, pp. 425-426.

[8]. Ibn Hajar, IX, pp. 363-368.

[9]. Zaydan, 11, pp. 146-147

[10]. Margoliouth, pp. 92-95.

[11]. IV, pp. 1104-1105.

[12]. Sayyid Sulaiman Nadvi, Mubammad b. Umar al-1Vaqidi, January 1967, pp. 8-26.

[13]. Brockelmann, Supplement (Leiden, 1943), pp. 141-142.

[14]. Cf. Ta’rikh Baghdad, I, p. 4-5.

[15]. Mu'jam, XVII, p. 279

[16]. Encyclopaedia of Islam, IV, p. 1104

[17]. Ta’rikh Baghdad, III, p. 3.

[18]. Tahdhib, IX, p. 364.

[19]. Cf. Tarikh Baghdad, III, p. 19.

[20]. Fihrist, p. 144.

[21]. Ibid.

[22]. Ibid.

[23]. It does not seem to [be a correct translation of the word s which means he always strictly observed taqiyya.

[24]. Encyclopaedia of Islam, IV, p. 1105.

[25]. Ibid.

[26]. CE. Fihrist, p. 144 5 Ibn Khallikan, I, p. 84.

[27]. Cf. Khatib, III, p. 20.

[28]. Ibid, pp. 144-145.

[29]. Cf. XVII, pp. 281-282.

[30]. Cf. Margoliouth, Lectures, p. 92.

[31]. Ibid, p. 95.

[32]. Cf. Jurji Zaydan, II, pp. 146-147.

[33]. Cf. Encyclopaedia of lslam, p. I 104; Lectures, p. 95.

[34]. II, p. 426.

[35]. Mu‘jam, XVII, p. 279.

[36]. Ta’rikh Baghdad, III, p. 3.

[37]. Cf. III, pp. 4-7.

[38]. Mu‘jam, XVIII, p. 281.

[39]. Ta’rikh Baghdad, III, p. 8.

[40]. Encyclopacdia of Islam, IV, p. 405.

[41]. Encyclopacdia of Islam, IV, p. 1105.

[42]. Encyclopaedia of Islam, IV, p. 1105.

★★★★★

*Dr. Amanullah Khan

# Aḫmad B. Dāwūd Abū Hanīfa Al-Dīnawarī
## (d.c. 282 A.H./895 A.D.)

Abū Hanīfa Aḫmad b. Dāwūd al-Dīnawarī, a well known, erudite and celebrated Muslim scholar was born at Dinawar – a city of Persian Iraq, Probably in the first decade of the 3rd century of Hijra. The sources, which throw light on his life and works are: Fihrist([1]), Mu'jam al-Udaba([2]), Bughyat al-Wu'at([3]), Khizanat al-Adab([4]), and the Encyclopaedia of Islam([5]), etc.

Yāqūt says about him:

ابو حنيفه الدينورى، اخذ عن البصريين والكوفيين واكثر اخذه عن ابن السكيت وكان نحويا ولغويا، مهندسًا منجمًا، حسبًا، راويةٌ ثقةً۔([6])

Abū Hanīfa al-Dinawarī received his education from the scholars of Basra and Kūfa, and profited chiefly from Ibn al-Sikkit. And who was a grammarian, lexicographer, geometrician, astronomer, mathematician and the most reliable reporter.

He further records on the authority of Abū Hayyān al-Tauhīdī, a debate which took place in the salon (a large room or a place for social gatherings) of Abu Sa'īd al-Sairafī, the grammarian, as to whether Abū Hanīfa al-Dinawarī or the great Jāḫiẓ of Baṣra was

---

* Chairman (R), Department of Islamic Studies, University of the Punjab, Lahore

the better stylist. Abū Sa'īd endeavoured to settle the controversy making Abu Hanifa's more idiomatic Arabic whereas Jāḥiz the more original in his matter and more attractive.([7])

The study of Mu'jam al-Udaba shows that Abū Hanifa occupied a unique and most honourable place not only among his contemporary Muslim scholars of repute, but also among those luminaries who had passed before him and who succeeded him. Abu Ḥayyān says that he placed three writers at the head of all who had ever composed any work: They were Jāhiz of Basra, Abū Ḥanīfa al-Dinawarī and Abū Zaid Ahmad b. Sahl al-Balkhi. About Abū Ḥanīfa he says:

> فانه من نوادر الرجال، جمع بین الحکمة الفلاسفه، وبیان العرب، له فی کل فن ساق، وقدم ورداء وحکم وهذا کلامه فی الانوا، یدل علی حظ وافر من علم النجوم، اسرار الفلک، فاما کتابه فی النبات فکلامه فیه؛ فی عروض کلام آبدی بدوی، وعلی طباع افصح عربی۔([8])

> And he was among the greatest scholars. He combined the wisdom of philosophers with the eloquence of the Arabs; in every department of knowledge he had a standing and these are his remarks about his book 'Al-Anwā', which lead us to believe that he was a proficient astronomer. About his book on Botany he says – 'He combined in it knowledge of the Bedouin with the eloquence of the true Arab.

To prove Abū Ḥanīfa's greatest skill at Philosophy, Yāqūt quotes a story of the great Mubarrad coming to Dinawar, where his host 'Īsa b. Māhān asked him the meaning of a difficult word in the Prophetic Tradition. Mubarrad being unprepared for the question, improvised a meaning for the word, and when asked for a quotation as a proof invented a rajaz couplet for the purpose. Later on when Abū Ḥanīfa was consulted in the same matter, he asserted that al-Mubarrad's quotation was a forgery, and that the word had quite a different sense from that which Mubarrad had assigned it. Al-Mubarrad was constrained to admit that Abū Ḥanīfa was right. ([9])

In addition to his profound scholarship, he was gifted with excellent moral qualities, which won him the respect of the

general public and the Caliphs alike. He attracted the notice of al-Muwaffaq Billah, the son of Al-Mutawakkil, who became his patron. Abū Hayyān after acknowledging his high position as a scholar says:

وهذا مع ورعه وزهده وجلاله قدره۔(10)

And it is in addition to his piety, supreme devoutness to God and greatness of his position among the public.

Al-Dinawarī is said to have been staying at Ispahan to make astronomical observations, which he recorded in his ‘Kitab al-Radd ‘Alā Rasad al-Isphania. He afterwards seems to have spent most of his time in his native town, where his observatory was pointed out for several centuries later.

The dates given for his death vary; according to Yāqūt he died in 282 A.H. or before 290 or in 280 A.H., according to Khizānat al-Adab, in 282 A.H., and according to A’lām and Tarīkh Adab al-Lughat al-‘Arabiyya also in 282 A.H. So 282 A.H./895 A.D. appears to be the most reliable date for his death.

## His Works

The list of his most comprehensive works, which is to be found in the Fehrist, Mu’jam al-Udaba’ and Khizānat al-Adab, is very miscellaneous. Geography, Botany, Mathematics, Astronomy, philosophy, Literary as well as General History and Qur’ānic Tafsir, etc., are all represented. The list includes works like ‘Kitāb al-Shi‘r wa’l Shu’ara, Kitāb al-Fasahat, Kitāb al-Anwa, Kitāb al-Bahth Fi Hisab al-Hind, Kitāb al-Jabar wa’l-Muqabalah, Kitāb al-Jama’wa’l-Tafrīq, Kitāb al-Buldan-al-Kabīr, Kitāb al-Nabat and Kitāb al-Akhbar al- Ṭiwāl, etc.

His works which seem to have acquired fame and won appreciation are his Kitab al-Anwa, Kitab al-Nabat and Kitab Akhbar al-Tiwal, Abū Hayyan’s remarks about his Kitab al-Anwa’ are sufficient to prove the importance and utility of that work. About his Kitab al-Nabat which is the most famous work on Botany. Yaqut on the authority of Ibn al-Nadīm says:

لم يصنف فى معناه مثله۔(11)

No work in that subject has ever been composed like his.

This work, as is the case with his other works with the exception of Kitāb Akhbār al-Tiwāl, has also been lost. But according to Borckelmann, numerous extracts of it have been preserved in the lexicographers, particularly Ibn Sida, and also in Ibn al-Baitar. This work was of much greater importance to Science. According to the same writer:

> It was the result of philological study of the old poets and was intended to explain the numerous plants mentioned by them… Besides, the description of plants, which have for the most part alone survived, the work, which was still accessible to the author of Khizant al-Adab in six large volumes, in addition to numerous illustrative quotations from the poets, must have contained many philological and historical excursus on the latter. It began with a detailed account of the kinds of soil and formation of Arabia, its climate and distribution of water, and the general condition necessary for the growth of plants. It then proceeded to treat of the classification of the plants in general and the morphological structure of the individual plants. ([12])

His third work namely, Kitāb Akhbār al-Tiwāl actually not a book of lengthy narratives as the title suggests, has come down to us in its entirely. It was edited by W. Guirgass and published in Leiden, in the year 1888 A.D.

It is a universal history on a small scale comprising 402 pages. It opens with an account of Adam, and the narrative is brought down to the end of the caliphate of Mu‘tasim (d. 227 A.H./841 A.D.) the ‘Abbasid Caliph. A feature of this work is that it omits Isnāds, a practice which was an early departure from the general Muslim way of writing History. The narrative is continuous. There can, however be no comparison between his work and of his contemporary Tabarī’s; a universal history which occupies 402 pages is obviously on a wholly different scale from the most comprehensive work of the other. Al-Dinawari, unlike Tabari and al-Balādhurī, has not discussed the Prophet’s (Peace be Upon Him) life in detail, rather he has given, so to say, a passing reference to it. Likewise, he throws light only on certain important aspects of the Orthodox Caliphate. It, however, devotes particular attention to matters of special interest to Persians. He, therefore,

gives a full account of the history of Alexander, of the Sasanids, the conquest of Iraq by the Arabs, with a detailed description of the battle of Qādisiya and of the administrative arrangements made by the Muslims in Persia. He also describes the battles of the Camel and of Siffin, the affair of the Kharijites, the tragedy of Karbala, the risings of Azraqis and Mukhtar b. Abi ‘Ubaid; the caliphates of ‘Abd al-Malik, Walid b. ‘Abd al-Malik and ‘Umar b. ‘Abd al-Azīz. After throwing light on the fall of the Umayyads, he proceeds to tell the story of the rise of the Abbasids; conveys information about some of their Caliphs and of the foundation of Baghdad, of the conflict between Amīn and Māmun. The account is closed as has been pointed out already with the death of Al-Mu’tasim which occurred in the year 227 A.H. Margoliouth criticises his above work by saying:

> He tells history in the style of a romancer; wherein private conversations are reported at length and the parties are made to bandy verses with each other. He exhibits little critical power. ([13])

The value of this work as an early source of Muslim History, however, is very great.

## References


1. Ibn al-Nadim, p. 116
2. Yāqūt, iii, pp. 26-32
3. Suyuti, p. 132
4. ‘Abd Al-Qadir b. ‘Umar al-Baghdadi, (Cairo, 1347), I, pp. 60-61
5. Vol. I, pp. 977-978
6. Mu’jam al-Udabā, iii, p. 26
7. Cf. Ibid, p. 27
8. Ibid, iii, p. 28
9. Cf. Mu’jam al-Udabā, iii, pp. 30-32
10. Cf. Yāqūt, iii, p. 28
11. Ibid, p. 32
12. The Encyclopaedia of Islam, I, pp. 977-58
13. Lectures on Arabic Historians, p. 113


★★★★★

# ادارہ علوم اسلامیہ کی اساتذہ محترم کی تالیفات

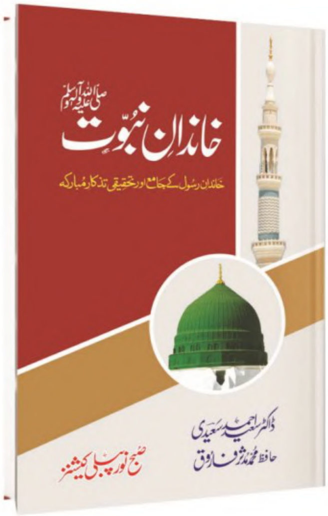


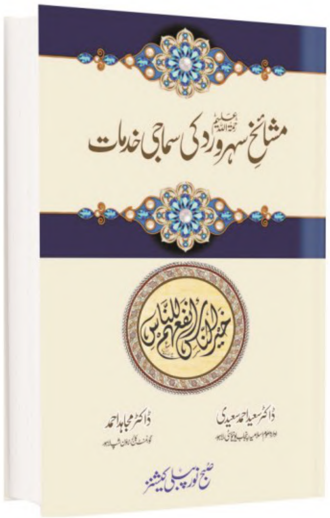


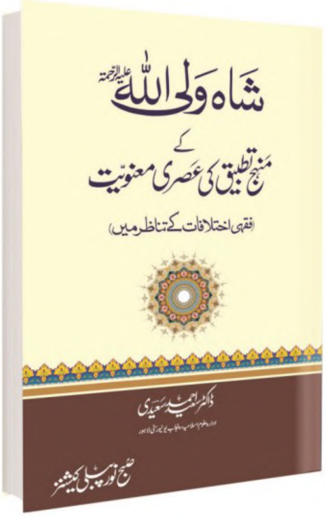


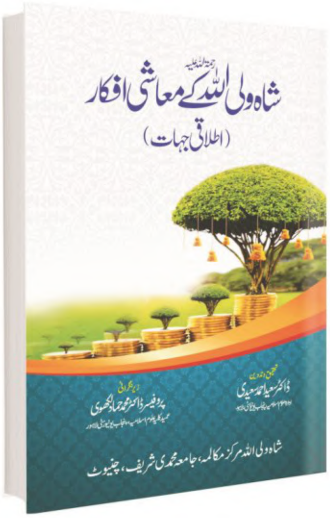

*Dr. Amanullah Khan

# Al-Baladhurī and His Contribution to Muslim History

Al-Balādhurī Ahmad b. Yahyā b. Jābir b. Dāwūd, one of the greatest Muslim historians, was born at Baghdad in the end of the second century H, i.e, in the beginning of the second decade of the ninth century of the Christian era.([1])

It would be quite proper and interesting to note here the joint statement of C. H. Becker and Rosenthal about the life of Al-Balādhurī, given by them in the *Encyclopaedia of Islam*.

> Al- Balādhurī Ahmad b. Yahyā b. Jābir b. Dawūd, one of the greatest Arabic historians of the 3rd/9th century. Little is known of his life. Neither the year of his birth nor that of his death is directly attested... As he is said to have been a translator from the Persian, Persian origin has been arbitrarily assumed for him... The statement that he was a tutor of the poet, ibn al-Mu'tazz, appears to be the result of a confusion of our historian with the grammarian Tha'lab, and the story that he died mentally deranged through inadvertant use of Balādhur, a drug believed beneficial for one's mind and memory, is meant to refer not to him but to his grand father, but even so, it constitutes a puzzle for which no satisfactory explanation is offered by the sources.([2])

---

* Chairman (R), Department of Islamic Studies, University of the Punjab, Lahore

Keeping in view the remarks of the above two great Orientalists, every possible effort has been made to search out authentic information about the life of Al-Balādhurī.

Both from internal and external evidences it is proved that his complete name was Ahmad b. Yahyā b. Jābir b. Dāwūd. His surnames were Abü Ja'far, Abu Bakr, Abu'l-Hasan and Abu'l-'Abbäs, and his most important nisbah was al-Balãdhuri.([3])

The puzzle about his nisbah can be solved from the account given by Ibn al-Nadīm,([4]) Ibn Asäkir,([5]) Ibn Kathïr,([6]) Khair-ud-Dīn Zirkilī([7]) and Professor P, K. Hitti,([8]) about Balādhurī. Brockelmann, the great scholar of the history of Arabic literature, has contended, on the authority of al-Jahshiyärī, quoted by Yäqüt in his Mu'jam al-Udaba', that it was Jäbir b. Dawüd who took Balādhur and not Ahmad b. Yahyā.([9]) But the account given by Jahshiyäri in his Kitāb al-Wuzrā' wa'l-Kuttāb, on which both Yāqut and Brokelmann have based their findings is in itself confusing and it seems as if Jahshiyāri, himself could not collect correct information about Ahmad b. Yahyā and Jabir b. Dāwūd, hence the confusion. On the other hand, Ibn al-Nadīm (d. 335 H.), a very careful author, is very clear about the matter. He says:

> ...وکان جده جابر یکتب للخصیب صاحب مصر۔ و کان شاعراً راویة و وسوس آخر ایامه فُشّدَ فی البیمارستان ومات فیه و سبب وسوسته انه شرب تمر البلاذر علی غیر معرفه، فلحقه مالحقه۔([10])

> And his grandfather Jabir was secretary to Khasīb, the minister of Egypt, and he (Ahmad b. Yahyā) was a poet and a historian, in his old age he was mentally deranged. So he was confined to the hospital, until he died in it. The cause of his illness was that he took Balādhur inadvertantly and then happened to him which is well known.

Al-Baladhuri belonged to a noble and respectable family which had a long-standing tradition of government service. His grand father Jābir served as secretary to al-Khasīb the minister of finance in Egypt, during the caliphate of Härün al-Rashīd,([11]) Jābir was a very good scribe and a reputed scholar. He must have passed this educational tradition to his son Yahyā, the father of our

historian.

This educational atmosphere prevailing at home served as a source of inspiration for a brilliant child like al-Balādhurī. Whereas on the one hand, he was inspired by his family traditions; on the other, his zeal for learning was further augmented by the literary pursuits and creative activities of the then Muslim world. This was an age of the golden prime of the Abbasids. By that time the Muslims had not only acquired the Greek and Indian sciences and the ancient lore of Persia, but had adapted and enriched these to their own needs and ways of thinking. Bayt al-Hikmah or The House of Wisdom" had already been set up by al-Māmūm. Religious sciences had taken definite shape. Specialists of each subject were too numerous to be mentioned even in volumes. Tremendous progress was being made in the field of different branches of knowledge like Quranic studies, *Tafsīr, Hadīth, Fiqh,* Arabic Grammar, Poetry, Literature, Philosophy, Scholasticism, Mathematics, Astronomy, Medicine, Geography, History, etc.

In such an atmosphere al-Balādhurī set out to acquire a skill at different branches of learning. He travelled in quest of knowledge to the various centres of Islamic learning and availed himself of the well-known scholars of his time. A very long list of his teachers is to be found in the early sources, A few are mentioned here. In Iraq, he studied with luminaries like 'Affan b. Muslim (131-220 H), 'Alī ibn al-Madīnī, Mus'ab al-Zubairī (155-236 H), Abū ‘Ubaid al-Qasim b. Salläm (157-224 H) Uthman b. Abi Shaybah, 'Ali b. Muhammad al-Madiäni (135-225 H.) and Muhammad b, Sa'd al-Katib al-Wãqidi (168-230 H.)([12])

His teachers in Damascus were Hishām b. 'Ammär and 'Umar b. Sa'īd, and others and in Emessa and Antioch, were Muhammad b. Musaffa and Muhammad b. Saham, and others.

The well-known scholar of literature and lughat Ma'mar b. al-Muthannā (110-209 H.) about whom Jāhiz has said:

لم يكن في الارض اعلم بجميع العلوم منه، وكان--- من حفاظ الحديث، له نحو ۲۰۰ مؤلف۔([13])

There was none in the world who excelled him in any of the branches of knowledge, and he was one of the Huffāz of Hadīth. Some two hundred works are ascribed to him)…was also among his teachers.

Al-Balādhuri's quest and tiresome labour for knowledge bore fruit very soon, and he was admitted to the noble assembly of the great scholars of his times. The branches of learning in which he acquired a skill were Hadith, Ansab or Genealogy, History, Geography and Poetry, etc. The great Yäqüt says of him:

وكان احمد بن يحيى جابر عالماً فاضلاً و شاعراً، روايةً نسَّابَةً، مُستقناً وكان مع ذلک كثيرالهجاء۔(14)

And Ahmad b. Yahyā b. Jābir wae a man of learning, a meritorious scholar, a poet, traditionist, genealogist, an accurate and perfect learned man, and in addition to all these qualities he was a great satirist.

This all-round knowledge of Al-Balādhuri won him praise from the Caliphs and their subjects alike. The Caliphs tried to attract him to their courts, and the people thronged around him to get a share from his erudition. Consequently he was admitted to the boon companions of the Abbasid Caliphs like al Mutawakkil, al-M'usta'in and al- Mu tazz, and others, Abbasid ministers like Ubaid Allah b. Yahyä and Ahmad b. Salih, also became his friends.

A very long list is given of his pupils, which includes some of the greatest scholars of his time, like Yahyā b, Ali b. al-Munajjam al-Nadim (241-300 H). Ja'far b. Qudämah (d. 310/319 H.), Abü Yusuf Na'im b. Qarqar al-Azdi and Ahmad b. 'Abd Allah b. Ammar and others. Abd Allah the most celebrated poet and brilliant son of the Caliph al-Mu'tazz was also one of his pupils. The account given by Khatib throws sufficient light on this matter,(15) Moreover the modern scholars like Professor Margoliouth, Professor Hitti, Jurji Zaydän and Dr Khurshid Ahmad Färiq, who are noteworthy biographers of al-Balādhurī, all agree that al-Balādhurī Was appointed by al-Mu'tazz teacher of his son Abd Allah.

Al-Balādhurī was a man of strong character. Dr S.D.F. Goitein says of him: It is impossible to see in Balädhurī's exposition any partisan tendency. Above, it has been made clear that his position at the court of Abbasid Caliphs did not have the slightest influence on him, when he described Omayyads.

It is characteristic that the Shiite al-Sharif al-Murtada, who made very extensive use of Balādhurī, says of him:

حاله فی الثقة عند العامة والبعد عن مقاربة الشیعة والضبط لما یرویه معروف۔

It is well known that he is an accepted Sunni authority, that he is far from supporting the Shiah and he is accurate in whatsoever he records.

Like the great Abü Mikhnaf whom he apparently valued very highly, Balādhurī, if one may so express, was a partisan of one class only: his own class of authors who wish to be interesting and therefore cannot resist a sensation and even a touch of scandal.([16])

Yãqut has given a very lengthy account of al-Balādhurī in his Mu‘jam al-Udabā. If, on the one hand this account throws light on the greatness and self-respect of al-Balādhurī on the other it brings to light a great defect in him. He took a special interest, as has already been quoted in satiric invectives, but the language of some of his couplets by Yaqüt is utterly lacking in sobriety and nobility. The use of such language could not be expected, from a noble and great person like al-Balãdhuri, whose Futūh al-Buldān apart from other factors enjoys a very high reputation as regards the use of excellent language is concerned.

Al-Balādhurī was mentally deranged in his old age. The cause or his illness was that he took Balādhur inadvertantly. Consequently, he was confined to the hospital for some time, but he could not recover firom his illness and he died in the hospital at Baghdad in the year 279 A.H, which date is attested by the most reliable historian and Muhaddith Hafiz Ibn Kathir, who gives the account of al-Balādhurī under the year 279 A.H., in his book on history written in the annalistic form.([17]) Moreover, the accounts given by Ibn 'Asākir and Yāqüt also in a way support the above year.

Now we come to the second part of the article, i.e. contribution of al-Balādhurī to Muslim history. Al-Balādhurī has with justice earned a high reputation as historian. The earliest mention of names of al-Balādhurī's works is made by al-Mus'ūdi in the introduction to his Murūj al-Dhahab. He places his work on history very high and appreciates it in the following words:

وکتاب التاریخ لاحمد بن یحیی البلاذری، وکتابه ایضاً فی البلدان و فتوحہا صلحاً وعنوةً من هجرة النبی وما فتح فی ایامه وعلی ید

الخلفاء بعده وماكان من الاخبار فى ذلك و وصف البلدان فى الشرق والغرب والشمال والجنوب۔ ولا نعلم فى فتوح البلدان احسن منه۔([18])

And Kitāb al-Ta’rīkh (Book on History) of Ahmad b. Yahyā al-Balādhurī is also on the history of countries and their conquest by surrender or by force since the Hijrah of the Prophet (that is) the story of the conquest in the Prophet's days and afterwards under the caliphs. As regards the history in it al-Balādhurī described the countries in the east, west, north, and south and we know no better work than his on the history of the conquest of countries.

Ibn al-Nadim furnishes us with the following information in this connection:

وله من الكتب: كتاب البلدان الصغير۔ كتاب البلدان الكبير ولم يتمه۔ كتاب الاخبار والانساب۔ كتاب عهد ارد شير ترجمه بشعر۔۔۔([19])

The work he produced are: Kitāb al-Buldan al-Saghir, Kitab al-Buldan al-Kabir which he could not complete, Kitab al-Akhbär wa'l-Ansab, and Kitab 'Ahd--Urdshir, which he translated into verse...

Yãqüt, on the authority of Ibn al-Nadim observes:

وقال محمد بن اسحاق النديم: وله من الكتب: كتاب البلدان الصغير كتاب البلدان الكبير ولم يتمه۔ كتاب جمل نسب الاشراف، وهو كتابه المعروف المشهور، كتاب عهد ارد شير، ترجمه بشعر، كتاب الفتوح۔([20])

And Says Muhammad b. Ishäq al-Nadīm: an the works he produced were: Kitab al-Buldän al-Saghir; Kitāb al-Buldān al-Kabir, which he could not complete, Kitāb Jamal Nasab al-Ashārf and that is his well-known and famous work Kitāb ‘Ahd-i-Urdshir which he translated into verse: and Kitāb al-Futih.

The so far known works of al-Balādhuri, irrespective of the difference in their names are:

(1) Futüh al-Buldān or Kitāb al-Buldän al-Saghir.
(2) Ansab al-Ashraf or Kitab al-Akhbar wa'l-Ansab or Kitäb Jamal Nasab al-Ashrāf.
(3) Kitab al-Buldän al-Kabir (an incomplete work).
(4) Kitab Ahd-Urdshir. An Arabic translation in verse of the original which was in Persian.
(5) Ar-Radd'alā ash-Seu'ubiyah.

The sixth book namely Kitab al-Futnk, added by Yãqüt in the list of al-Balãdhurï's works seems to be a mere repetition of Kitāb al-Buldān or Futülh al-Bul dan.

Three out of the above five works of al-Balādhuri namely Kitāb al-Buldan al-Kabir, Kitāb ‘Ahd-i-Urdshir and ar-Radd'alā ash-Shu'übiyah, have either been lost or are still under the veil of ignorance. The other two, i.e. utülh al-Buldān and Ansab al-Ashrāf, have been indentified. Futüh al-Buldän has seen the light and has also been translated into different languages like English and Urdu, etc. Some volumes of Ansab al-Ashraf have also been published, while others are still awaiting their publication.

The book Futūh al-Buldān is a concise history of the Muslim conquests by force, surrender or capitudation right from the Hijrah of the Prophet (be peace upon him), to al-Balādhurī own times. The book has been divided into different parts. Thus the various territories receive the attention of our historian under different headings. The conquest of Arabia, Syria, Mesopotamia, Armenia, North Africa, Andlusia, Iraq and Persia, Media, Adharb'ījän, al-Mawşil, Jurjān, Ţabaristān and their districts, Faras and Kirmän Sijistān and Kabul, Khurāsān, and Sindh etc. has been dealt within separate chapters.

Some chapters dealing with the social aspect of histhory and the colonigation have also been included in this book, which enhance its value in the eyes of the modern historians. In this connectios the portions dealing with the wells of Mecca, the floods in Mecca, declaring Arabic as a state language, Qaraṭis, the founding of al-Kūfah, Başrah and al Baghdãd are of worth our attention. The last chapter dealing with the laws of Kheräj Lands, history of the 'Ata in the Caliphate of Hadrat Umar bin al-Khaṭṭäb, the seal, the coinage and Calligraphy, is of immense importance according to the modern point of view of history.

Commenting on the need of composing such a work says Hitti, "Campaigns playing an important role in the life of Muhammad (SAW) and the early Caliphs soon began to assert their claim for special attention and were treated in special books. Besides, the necessity of recording and studying the compaigns arose from the fact that in levying a tax (Kharāj) on the conquered land, those in authority were first confronted with the task of determining whether it was taken by Peace', by Capitulation' or by force', and what the terms in each case were. This gave rise to many books on compaigns (maghäzi), are of the oldest of which is al Wakid's (d. 207/822). Some books were issued treating of the conquest of one city, most of which books have been lost. Given a number of books on the conquest of different cities, the next step would be to compile them into one whole. That step was taken by al-Balãdhurī the last great historian of Moslem Campaign.([21]) It is due to this unique character of al-Balādhurī's work that his great contemporary al-Mas üdi takes delight in saying about al-Buldān:

ولا نعلم فی فتوح البلدان احسن منہ۔([22])

And we know of no better work on the conquest of countries than his.

A thorough study of this work brings to light the following additional facts.

(1) That the author is very careful in giving exact dates to the important episodes.
(2) He is careful in the matter of using appropriate language.
(3) Poetry is avoided as far as possible.
(4) He takes great pains in order to give exact information. Through out his work, the sincere efforts of the author to convey the most authentic evidence is felt, It seems as if he had to dispose of the conquest of Andlusia in a few lines, only because he could not get a first hand information about it.
(5) His geographical information is accurate.
(6) Its style is marked by condensation.

Al-Balādhurī's monumental work Ansäb al-Ashrāf was in modern times identified by Ahlwordt, who in 1883 A.H. published a fragment of this book. Later on at the Thirteenth International Congress of Orientalists which took place in Hamburg in 1902,

C.H, Becker announced that he had discovered a complete manuscript of the Ansāb in Istanbul, and that he proposed to publish it. The proposal was supported by many distinguished Orientalists and some offered their collaboration. But for various reasons the effort proved ineffectual. Finally on the suggestion of Professor C. Weil the project was entrusted to the then newly formed, School of Oriental Studies in the Hebrew University. Consequently with the laborious efforts of Dr S. D. F. Goitein and Max Schloessinger, IV-B. and V. Volumes of the work were published. But unfortunately the work could not be carried on due to the break of World War II.

Some years ago the Arab League established a Department for the revival of Arabic Manuscripts. This department undertook to publish the whole work. The project was entrusted to Dr Hamïd Ullah, with whose tiresome efforts its first volume saw the light in Egypt in 1959. Other volumes are still awaiting their publication. The work has probably been stopped for reasons unknown. So far published material is even less than the one-third of the whole book, which actually is in twelve volumes containing 1227 folios or 2454 pages, each page measuring at about 9"x 4" and having from 32 to 37 lines in it.

A thorough appraisal of the work is impossible unless and until we have a photostat, microfilm or published copy of the whole of it before us. The frame work of the book is genealogical. From the study of the published material and after going through the summaries of contents of the whole manuscript prepared by Dr. S. D. F. Goitein([23]) and Dr. Khurshid Ahmad Färiq,([24]) we can easily understand the scheme followed by the author. The book is a detailed history of the Arabs arranged in a genealogical order. At the beginning of the book there is a brief outline of the genealogy of the Arabs of Ismailite stock, from Noah to the tribal ancestors of Quraish. Then there is a detailed account of the Hashmites, which includes a comprehensive biograghy of the Prophet Muhammad (Peace Be Upon Him). Among the desendants of Abū Talib, Hadrat 'Ali receives as special attention of our author.

Among the Abbasid caliphs only the two first have been described with any degree of completeness. On the other hand a complete history of the Umayyad Caliphs with their comprehensive biographies is described.

Their account covers about one-third of the whole work.

Less than a quarter of the book deals with the tribes of Mudar, except Quraish, like Kinānah, Asad, Hudhail, Muzainah, small tribes ascribed to Udd, the tribe of Tamim and the whole of Qais, etc.

The book includes in its fold the biographies of statesmen, poets, warriors, judges, wisemen and the religious leaders etc.

We may sum up some of the most important points in connection with this work as follows:

(1) The book is not merely a genealogical and biographical record; it provides within the biographies of the caliphs a continuous account of the history of their times, even in those matters in which the caliph was himself outside the story.
(2) The book deals not only with the political and biographical details of important personalities, but also imparts light on the lives, literary pursuits and achievements of men of learning. Thus there are extensive biographies of poets like Farāzdaq and Jarir, of an authority on proverbs like Aktham b. Saifi, of a notable judge like Iyās b. Mu'awiyah, and also of early religious leaders like 'Abd Allah b. Mas'üd and Sufyän al-Thauri, etc.
(3) It is a comprehensive history of the times of Muhammad (Peace Be Upon Him), four orthodox caliphs, Umayyads and the first two Abbasid caliphs.
(4) A detailed history of the Kharijites and their literary pursuits are to be found in this work.
(5) Arabic poetry has been preserved in this work to such an extent that Dr Goitein is of the opinion: "When the Ansab is completely published, it will be clear that this work represents one of the richest collections of ancient Arabic poety.([25])
(6) Influence of the Science of Tradition is seen throughout his work. The author is very particular in affixing a chain of authorities to the text.
(7) The sincere effort of the author to convey exact in for mation is felt throughout.
(8) The author is very accurate and careful in giving dates of

the important events.

(9) The author is impartial in reporting his historical information so much so that Dr Goitein suggests the other orientalists to modify the generally accepted view that Umayyad history, under the influence of the Abbasid court, was presented badly or misrepresented. He says, How was it possible for Balādhuri, a member of the entourage of the Abbasid Caliphs, to descrilbe the Umayyads not only at such length, but also with perfect objectivity, or as appears from certain pages, even with sympathy? Professor D. S. Margoliouth, in his small, but very instructive book on Arab Historian (p. 16) points out that Arab historiography was remarkably objective because the historians enjoyed a position of financial independence. However, Baladhuri was no landed proprietor like Tabari, for instance, but a court official, and he came of a family of oficials of the Caliphs. It seems that we should modify to some extent the generally accepted view that Umayyad history, under the infiuence of the Abbasid court, was presented badly or misrepressented.([26])

While evaluating of al-Balādhurī's above work the learned doctor says:"To sum up the conclusions obtained so far: Baladhuri was acquainted with the principal forms of historiography which the three preceding generations of historians had devised, and he made use of all these methods. In the essentials, however, he chose to shape his book in accordance with a principle that was peculiarly Arab, both in his selection of material and in its arrangement.

A system of genealogies has special advantages for the history of the Arabs. For example, it is of some relevance that in this volume, (i.e. V) immediated after the caliphate of ‘Uthmān, we find the account of ‘Uthmān's family, and especially of the rise of the Marwanids. The rise to power of the Marwanids only occurred some thirty years after ‘Uthmān's death, but was due, to a considerable extent, to the part played by Marwan during ‘Uthmān's caliphate. Such literary continuity mirrors faithfully the historical sequence. Again, before describing the Abbasid caliphs, Balädhuri gives us the extremely interesting story of this family before its rise to power, in a chapter which is of considerable

length. Another instance is the chapter which gathers to gather the unsuccessful attempts of the 'Alids to assume the caliphate, which extended over generation.([27])

**His Evaluation as a Historian.** Having critically appreciated his historical works, it is now quite appropriate to evaluate al-Balādhuri as a historian. It goes to the credit of this great Muslim historian that two great forms of Arabic historiography named, "Conquests" and Genealogy" saw completion in his person. Hitti Says, "Two of the leading historians of the Moslem conquests was the Egyptian Ibn ‘Abd al-Hakam (870-871)...and the Arabic-writing Persian Ahmad b. Yahya al-Balādhurī (892) whose main works were the Futiüh al-Buldan and the Ansab al-Ashrāf. The latter was one of the first to integrate the 'many stories of the conquests of various cities and lands into one comprehensive whole, thus ending the era in which the monograph was the typical form of historical composition.([28])

Rosenthal, while describing genealogical form of Muslim historiography observes: "On a larger scale, as it has been stated, genealogy influenced historical writing in the Ansab work of al-Balädhurī, whose contents were exploited by later historians such as Ibn al-Athir in his kamil, and in the genealogical literature of western Islam.([29])

Both of his above works, even since their composition have enjoyed a high reputation among the Muslim and non-Muslim scholars alike. Those who have written on Muslim history have used him freely. The writers who quote Ansäb include scholars like al-Sharif al-Murtadā, Ibn Asakir, Yãqüt, Ibn Khallikän, Ibn Hajar al-Asqaläni, al-Mas üdi Ibn al-Athir and many others.([30])

His Futüh al-Buldän has likewise, influenced immensely the writing of many scholars of repute. Professor Hitti says in the introduction of Futuh al-Buldān "Not only did later historians draw freely from al-Balādhurī but subsequent geographers used him extensively as a source.

The above sketched attempt to view al-Balädhurī in his historic setting warrants the conclusion that the tradition recorded by him was mostly communicated by him by word of mouth and partly through book that have mostly been lost, and that it was a source for al-Mas'udi and Yãqüt, and through them for many

subsequent Arabic historians and geographers.([31])

As regards his qualities as a historian, we have already described some, while citically examining his works. So we need not repeat those here. One thing, however, which invites our special attention is his objective historical approach. It is remarkable when even the Shi'ite Sharif al-Murtadā says of him:

حاله فی الثقه عند العامه والبعد من مقاربة الشيعة والضبط لما يرويه معروف۔([32])

It is well known that he is an accepted Sunni authority, that he is far both supporting the Shi'ah, and that he is accurate in whatever he records.

In the opinion of De Goeje, he did not write any introduction to his from existing works, for the only reason that he, unlike most of his contemporary scholars, wanted to avoid unnecessary praise of the caliphs. It may be noted that in those days it was a general practice with many writers to show great reveren ce for the caliph in seat and to lavish praise on him in the introduction of their proposed works.([33])

It has already been made clear that his position at the court of the Abbasid caliphs did not have the slightest influence on him when he described the Umayyads.

Appreciating this noble spirit of Al-Baladhuri, Dr Goitein observes: Like the great Abü Mikhnaf, whom he apparently valued very highly, Balãdhuri, if one may so express oneself was a partisan of one class only: his own class of authors, who wish to be interesting and therefore cannot resist a sensation and even a touch of scandal.([34])

Such noble qualities of Al-Balãdhurī, and his valuable contribution in the field of knowledge has won him praise from scholars both ancient and modern. It would not be out of place if in the end we quote the opinions of certain great scholars about him.

Ibn 'Asakir who is a noteworthy biographer of al-Balādhurī describes him as Sahib Al-Ta'rikh (tho author of history), any further explanation being unnecessary.([35])

The opinions of al-Mas'üdi, Sharīf al-Murtadä and Yāqüt we

have already quoted.

The great historian Ibn Kathir opens his account about him with the words: Al-Balādhurī… one amongst the greatest historians... ([36])

C. H. Becker says of him: Al-Balādhuri...one of the greatest Arabic historians of the third/ninth century....([37])

Similarly Professor Hitti, Margoliouth, Browne, De Goeje, Jurji Zaydan, Khairuddin Zirkili, Dr M. Hamīdullah and others have held him in very high esteems and have got a very high opinion about his works.

## References


[1]. Cf. Jurji Zaydan, Tärikh Adal al-Lughat al-"Arabiyyah (Egypt, 1912), II, 191.

[2]. Encyclopaedia of Islam (Ed. 1959), 1, 971 (Fasc. 16).

[3]. Cf. Al-Baladhuri Ansâb al-Ashrāf, Ed. Dr Hamidullah (Cairo 1959), I pp. 3, 107, 252); al-Mas'üdī, Muruj al-Dhahab (Cario, 1346 H.), I, 14; Ibn al-Nadim, Fibrist (Leipzig, 1871), p. 113; Ibn 'Asäkir, Tārīkh al-Kabir (Syria, 1330 H.), 109; Ibn Kathir, al-Bidâyah wa'l-Nihāyah (Egypt), 65.

[4]. Ibn al-Nadim, op. cit., p. 113.

[5]. Ibn 'Asakir, op cit., II, 109.

[6]. Ibn Kathir, op. cit., XI, 65

[7]. Khair-ud-Din Zirkili, al-A'lam, (Egypt, 1927), I, 85.

[8]. Introduction to Futüh al-Buldān (New York, 1916), p. 6. Translated by Professor (Hitti in English in The Origins of the Islamic State.

[9]. Brockelmann. Geschichte der Arabischen Literature (Leiden, 1937), Supp. I, 216.

[10]. Ibn al-Nadim, op. cit., p. 113.

[11]. Al-Jahshiyarï, Kitäb al-Wuzarä wa'l-Kuttāb (Egypt, 1938), p. 254.

[12]. Cr. Yāqūt, Mu‘jam al-Udaba' (Cairo, n.d.) relevant portions Khair-ud-Din Zirkili, op. cit., relevant portions.

[13]. Zirkili, op. cit., 1058.

[14]. Yãquüt, op. cit., p. V, 92.

[15]. Khatib Baghdadi, Târīkh Baghdäd (Cairo n. d.), X, 95-96.

[16]. Al-Baladhuri, Ansab al-Ashräf, (Jerusalem, 1936), V, 23-24 (Introduction).

[17]. Ibn Kathir, op. cit., XI, 65.

[18]. Al-Mas'udi, op. cit., I, 14.

[19]. Al-Fihrist, p. 113.

[20]. Mu‘jam, op. cit., V, 99-100.

[21]. Futuh al-Buldān, Trans. Hitti, Introduction, p, 5.

[22]. Muruj, 1, 14.

[23]. Introduction to Ansab al-Ashraf Terusalem, 1936), V, 11-13.

[24]. "Baladhuri Ki Ansāb al-Ashraf", in the Burhan (Delhi, April 1957), pp. 208-23.

[25]. Introduction to Ansab, p. 20.

[26]. Ibid., pp. 15-16

[27]. Ibid. pp. 20-21.

[28]. History of the Arabs (London, 1940), p. 88.

[29]. Rosenthal, Muslim Historiography, p. 88.

[30]. Cf. Introduction to Vol. V of Ansab, pp. 24-25.

[31]. Ibid, pp. 10-11.

[32]. Quoted by 'Abd al-Sattär Farrāj in the Introd. of Ansab ed. Dr. Hamidullah, I, 14.

[33]. Futüh al-Buldan, Urdu trans. by Sa'id Abu'l-Khair (Hyderabad, 1932), introd. by Geoje, p. 8.

[34]. Introduction to Ansab, p. 24.

[35]. Ta’rikh al-Kabir, ii, 109.

[36]. Al-Bidāyā wa'l-Nihāyah, xi, 65.

[37]. Encyclopaedia of Islam, New Ed. 1, Fas. 16, p. 971.

★★★★★

## ادارہ علومِ اسلامیہ کی اساتذہ محترم کی تالیفات

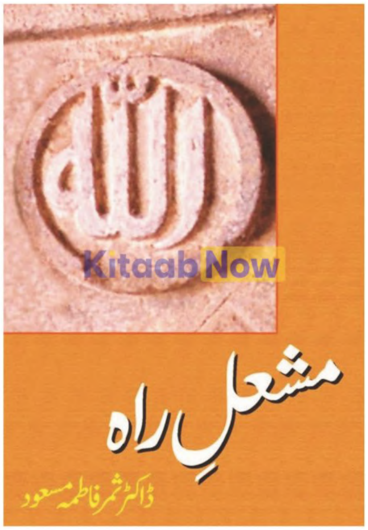


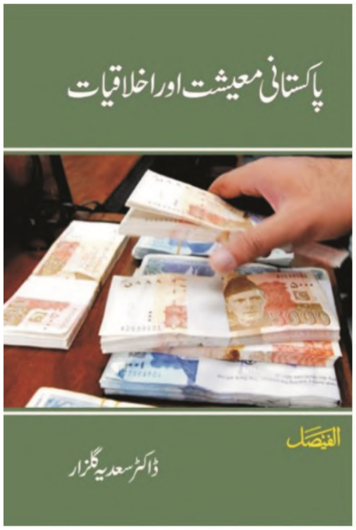


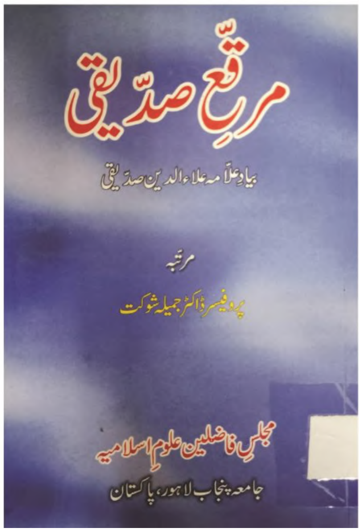


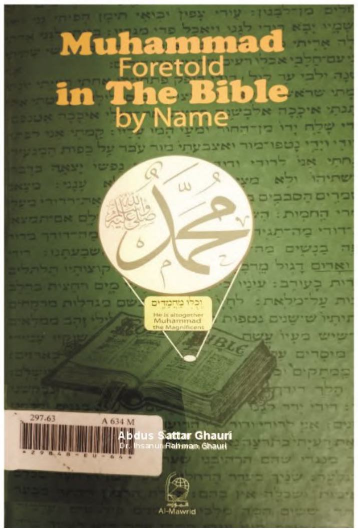

*Dr. Amanullah Khan

# A Critical Appraisal of al-Ṭabarī's Contribution to Muslim Historiography

The third century of Muslim Era which saw the golden prime of the Abbasids was one of the most fertile periods of Islamic learning. To whichever field we turn our attention we find standard works composed and we see scores of celebrated scholars serving the noble cause of knowledge. So great and copious was their literary activity that even in an advanced age like ours a student of history and literature, while studying their lives and activities is thrown into a state of astonishment. It is told that Abu Ja'far Muhammad bin Jarir, whom we are going to discuss here, proposed to dictate a historical work to his students: the number of leaves which he at first proposed to cover was 30,000, as the students held that life would not be long enough for the composition of such a work he reduced the number to one tenth, 3000 leaves which corresponds fairly with the bulk of the work in the editions of Leyden and Cairo. This composition left him time for a work of similar bulk on Qur'anic Tafsīr, which also is said to be one tenth of the amount originally contemplated. For the forty years of his later life the average amount which he wrote was forty leaves a day; those who divided the leaves which he had covered by the days of his life from the cradle to the grave found that he had written fourteen leaves for each days of his existence.([1])

---

* Chairman (R), Department of Islamic Studies, University of the Punjab, Lahore

Almost all the subsequent writers, while writing about Muslim history and Muslim scholars have given Ibn Jarīr a very high place in their works. Some of the sources which have been consulted while preparing this article are: Ibn al-Nadīm([2]), Ibn-Khallikan([3]), Khatīb Baghdādī([4]), Yaqut([5]), Subkī,([6]) Ibn Hajar([7]), Encyclopaedia of Islam([8]), Encyclopaedia Britannica([9]) and De-Goeji([10]) etc. These sources convey the information that Abū Ja'far Muhammad b. Jarīr al-Tabarī was born at the end of 224 A.H. or in the beginning of 225 A.H. (838-839 A.D.) at Amul, the chief place of Tabaristan, whence he is commonly named al-Tabari. From his very early age he showed the greatest zeal for learning and exhibited an extraordinary intelligence. At the age of seven he learned the Qur'ān by heart, at age of eight he led the prayer in Mosque and on reaching the ninth year of his age he started taking down the Traditions. He started his studies at his native town and upon the completion of his elementary education, he obtained permission from his father, who was a well to do person, to visit the great centres of Islamic learning, such as Ray and Baghdad, besides other places in Iraq and Egypt. He was only of twelve years when he left his native town in search of knowledge. First of all he proceeded to Ray, where he benefitted himself in Tafsir and Hadith etc., among others from such scholars as Muhammad b. Hāmid al-Rādi and Ahmad b. Hammād al-Dulābī. Says Abu J'afar. "We used to take down (Hadīth) with Muhammad b. Hamid al-Radi. He would come out to us several times in the night to ask us what we had taken down, which he would proceed to read to ensure accuracy. We used to go to hear Ahmad b. Hammād al-Dulābī who lived in a village some little distance from Ray, and then run back like mad in order not to miss Muhammad b. Hāmid's lecture.([11]) It is said that Ibn Hāmid communicated to him more than 100,000 traditions.([12])

From Ray Tabari proceeded to Baghdad where he intended to study under Imām Ahmad b. Hanbal, who however died shortly before his arrival there. Tabarī stayed for a time in this great centre of Islamic learning and kept himself busy acquiring more and more knowledge, with leading scholars of that place. His zeal for learning took him to Basra also. On his way to Basra, he stopped for a while at Wasit-the city populated by Hajjāj b. Yūsuf. From Basra he proceeded to Kūfa, where he learned different religious sciences with such luminaries as Abū Kuraib Muhammad b. al-Ala

al-Hamdhānī, Hammād b. al-Sarri and Ismā'il b. Mūsā etc. Abū Kuraib was authority on Hadith. Says Abu Jafar, "In the company of other students who desired admittance, I presented myself at the door of Abu Kuraib, who put his head out of a window and asked: which of you know by heart what he has taken down at my dictation? All the students looked at me, and said doubtless you do. I replied in the afirmative, and I was able to reproduce the Tradition (i.e. could satisfy the rigid test of the Shaykh)([13]) Tabari obtained from Abu Kuraib more than 100,000 traditions.

From Kufā he again returned to Baghdad. This time he stayed there for a long time and took to the diciplines of law (Fiqh) and the studies connected with the Qur'an. Thence he travelled westward for Egypt. On his way he attended courses at Syrian coastal and border cities, and he reached Fustat-the capital of Egypt, in the year 253 A.H.([14]) In Fustat, at that time, Abu-1-Hassan Ali b. Siraj al-Misri, was the most erudite and renowned scholar and was the most hospitable as well. He found Tabari an expert, not only in almost all the branches of learning related to religion, but also having a great skill at poetry, Lughat, Nahv (Grammar), Literature etc. Tabari was able to recite before him, from his memory, the Diwan of Tirimmah, which Ibn Siraj had been searching for.

At Fustat he founded a law school of his own, having previously followed that of Imām Shafi'i. Yāqut tells a story about Tabari, which indicates that even while at Fustat, his reputation as a scholar had risen to the highest peak. There he was beset by the learned persons of all sorts, examining him in the different branches of knowledge in which they themselves had acquired a skill. One day one of these persons asked him a question about prosody ('urud). Tabari had not previously devoted any attention to that subject, but was unwill ing to plead ignorance. He got the questioner to put off his question for a day, and in the meantime borrowed the treatise of Khatib b. Ahmad, the classical authority on the subject. By the time, the questioner repeated his visit, Tabari had become a Matrician ('urudis).([15])

From Egypt he again returned to Baghdad and this time to settle there finally. During this stay at Baghdād he paid two visits to his home in Tabaristan, the second visit he paid in 290 A. He had to quit Tabaristan after his last visit, because the practice of

maligning the three first Caliphs was rife in the province, and Tabari was afraid of personal injury owing to his views. The governor of the province sent his men to have Tabari arrested, but he was informed in time by a friend, so he escaped.

At Baghdad he became a man of great authority. He devoted himself to an extremely prolific and versatile literary activity and continued imparting a very useful instruction unto his pupils, who came from the remotest corners of the Islamic empire to hear him. Such was the esteem in which he was held that a famous theologian once said: Should you undertake the long journey to China, only to hear Tabari explain the Quran, it would be worth the trouble.([16]) He however, got into trouble with the Hanbalites owing to his remarks about Ahmad b. Hanbal, which sounded to his followers disrespectful, and due to his interpretation of certain Hadith related to 'al-Jalus 'Ala-al-'Arsh'. The enraged Hanbalites flung inkstands at him and pelted his house with stones, which were removed by the police. In order to console the uncompromising persons he had to compose a book wherein he wrote about his faith and expressed his praise for Imam Ahmad b. Hanbal. His monumental work Ikhtilaf al-Fuqaha in which he had differed at certain points with Imam Ahmad b. Hanbal was not published till after his death. Tabari died at Baghdad in the year 310 A.H., and his body was laid to rest in a house in Rahbat Ya'qub.

## His Evaluation Particularly as a Historian

Tabari's literary activity, as has already been pointed out was very enormous. He has composed valuable works in different branches of knowledge. Ibn Kamil tells us how Tabari divided his day: from noon till afternoon he was occupied with writing. After the afternoon prayer he would go to the Mosque and give lessons in the Qur'ān until the ‘Asr prayer. After that he would give lessons in Jurisprudence and then he would return to his residence.([17]) Khatib Baghdadi pays him a tribute in the following glowing words:

**وكان احمد ائمة العلماء يحكم بقوله ويرجع الى رايه لمعرفته وفضله و كان قد جمع من العلوم ما لم يشاركه فيه احد من اهل عصره...([18])**

And he was among the leaders of the scholars; disputes were decided on his dictates and due to his knowledge and erudition his opinion was held supreme. He had obtained skill at so many branches of learning that no scholar of his time could reach his intellectual level.

Yāqut, on the authority of Abu Muoammad ‘Abd al-Aziz b. Muhammad al-Tabari says of him:

كان ابو جعفر من الفضل و العلم و الذكاء و ذوالحظ على مالا يجهله احد عرفة لجمعه من علوم الاسلام ما لم نعلمه اجتمع لاحد من هذه الامة ولا ظهر من كتب المصنفين و انتشر من كتب المولفين ما انتشر له، وكان راجعاً فى علوم القران و القراءات وعلم التاريخ من الرسل والخلفاء و الملوك واختلاف الفقهاء...([19])

Abu Ja'far was so erudite, well informed, intelligent and had such a great memory that every body acknowledged him. He is well-known in a.cquiring a great skill at so many branches of Islamic learning, that no other among the Muslims is known to have excelled him. And no work of the authors and compilers has won the fame and publicity as his books have acquired, He was especially noted for his deep understanding of Quranic learning, Qirā’at, the history of Prophets, Caliphs, kings etc. and the diversity of the opinions of the jurists.

Do Goeji while writing on Tabari and early ‘Arab Historians says:

…AII these histories are more or less thrown into the shade by the great work of Tabari, whose fame has never faded from his own day to ours, and who well deserves to have this article on early Arabic histories placed under his name. ([20])

He goes on writing:

The success of the annals and commentary was due above all to the author's personality. The respect paid to him by his contemporaries appears in various anecdotes preserved in his biography. His pupils had an unbounded admiration for his extraordinary knowledge, and what he said seemed

> to them the best that could be said. In truth, both his great works were the best of their kind, especilly the commentary whih in the judgement of all impartial critics has not been equalled before or since, in completeness, learning, and independent judgement. A contemporary says 'that it would be worth a journey to China to procure the Book. So general was this view that the opinion of Tabari was quoted as a legal authority.([21])

Thus Tabari occupies a unique position not only among the Muslim scholars of repute but also among the most eminent historians of he world, His great historical compilation Ta'rikh-al-Rusul wal-Muluk, the distinguishing features of which are completeness of detail, accuracy, and the truly stupendous learning of its author that is Tevealed throughout, and that makes the work a vast store house of valuable information for a historian as well as the student of lslam, is a standard authority of a high rank for early Muslim history. In the words of Margoliouth: probably we are to regard Tabari as nerforming for history a task similar to what Bokhari and Muslim did for Tradition. The selection of really historical matter out of the quantity of material preser ted by the works of Mada'ini and others. Followed by the difhcult and to some extent dangerous task of bringing the record upto his own time.([22])

Rudi Paret observes: "Tabari's most important work is his history of the world (Tarikh-al-Rusul wal Muluk). The well known Leyden edition gives only an abbreviated text of the huge work which is said to have been ten times as long but even it fills 12 ½ volumes,([23]) Tabari procured the material" he says further, "for his history of the world from oral tradition, for the collection of which he had sample opportunity on his wide travels which were mainly devoted to the *talab al-ilm*, and in studies under celebrated scholars. He also used literary sources... Tabari did not work up the material into a connected account of historical events. He was rather content to record the different, often contradictory, accounts, as they were handed down to him. He therefore declined any responsibility for the reliability of the traditions collected by him. But it is just in the conscientious unharmonised repetition of the collected material of tradition that the value of Tabari's work for modern historical research lies, especially when it is a question of reconstructing the events of the early period of Islam.([24])

Certain remarks of R. Paret, pertaining to Tabari's selection of traditions, contradictary accounts given in the annals and repetitions termed as unharmonious etc. can be reviewed in the light of the opinion of De. Goeji who says, Nevertheless the value of the book is very great. The author's selection of tradition is usually happy, and the episodes of most importance are treated with falness of details so that it deserves the high reputation it has enjoyed from the first. This reputation rose steadily; there were twenty copies (one of them written by Tabari's own hand) in the library of Fatimite Caliph Aziz (latter half of the 4th century). Whereas when Saladin became lord of Egypt the princely library contained 1200 copies (Maqrizi 1.408). Only princes and rich men could own a book which in the time of Aziz cost one hundred dinars. We know that it had a place in most great libraries in other countries, for we find that it was used in all hands. Thus the fact that no complete copy can now be found anywhere and that the Leyden Edition rests on old volumes Iying in various places, gives a striking image of what the east has suffered from barbarism.([25])

The text of the Annals contains the history from the creation till the year 302 A.H. The work begins after an introduction with the history of Prophets and rulers etc. of the early period. Then comes the history of the Sasanian period, and of the period of our Holy Prophet and the first four Caliphs; the history of the Umayyads; and lastly the history of the Abbasids upto 302 A.H. From the beginning of Muslims era the material is arranged annalistically under the years of Hijra.

We get an idea of the length of time taken by the physical effort of copying such a work as either of his Qur'anic Tafsir and history from the story of some one who claimed to have taken the whole Commentary down from Tabari's dictation. It had taken eight years, from 283 A.H. to 290 A.H. The history he then tells us, was completed on Wednesday last but two of Rabi II, 303, having been contiuned to the end of 302.([26])

A striking feature of Tabari's works is the impartiality with which he proceeds. As is evident he was not a court historian. He was never ready to accept any material assistance from the state authorities. Although he had a modest competence an income from his estate in Tabaristan, he rejected all financial advantages and even refused Iucrative official position offered him. Even he is

said to have been hesitating in receiving any gift which was greater than he could match with a return gift. This strength of character is also visible in his writings.

From the Encyclopaedia Britannica we come to know that the Annals of Tabari soon came to be dealt with in various ways. They were published in shorter forms with the ommission of the names of authorities and of most of the poems cited, Then many supplements were written, e.g. by Ferghani (not extant) and by Hamdhani (partly preserved in Paris), Arib of Cardova made an abridgement adding the history of the West and continuing the story to about 365. Ibn Miskawaih wrote a history from the creation to 369 A.H., with the purpose of drawing the lesson of the story, following Tabari closely, as far as his book is known, and seldom recurring to other sources before the reign of Muqtadir. In 352 A.H. an abridgment of the Annals was translated into Persian by Balami, why, however, interwove many fables. Ibn al-Athir (d. 630 A.H.) abridged the whole work, usually with judgement, but sometimes too hastily... later writers took Tabari as their main authority.([27])

**His Works**

In addition to his two monument works on Tafsir and history, namely 'Jāmi Al-Bayān 'An Tawil al-Quran' and Tarikh al-Rusul wal Muluk wal Khulafa', Tabari composed many other works, a mention of which is to be found in the sources cited in the beginning. The names of certain important works are given below:

1. Kitab Basit al-Qaul Fi Ahkam Sharai' al-Islam'-a juristice treatise.
2. Tarikh Al-Rijal Min al-Ashab wa'l-Tabi'in.'
3. 'Kitab al-Qira'at wa Tanzil al-Qur'an.
4. Kitab Latif al-Oaul Fi Sharai' al-Islam'-a monumental work on Fiqh.
5. Kitab Khafif al-Qaul.
6. Kitab Ikhtilaf Ulama al-Amsar.'
7. 'Athar al-Baqiyah 'An Qurun al-Khaliya.
8. "Kitab Tahdhib al-Athar fi'l-Hadith' – An account of the traditions of the Prophet.

At the time of his death he was engaged on a great treatise on ethics, similar in plan to Ihya al-Ulum afterwards produced by al-

Ghazzali. Unfortunately most of the works of this great author have been lost to us. Those surviving in addition to his History and Tafsir are:

1. A fragmentary compendium of his Tarikh al-Rijal which has been published as an appendix to the Leiden edition;
2. Fragments of work on the diversity of opinion of the chief Jurists and,
3. The first part of a compendium on the principles of law, entitled al-Tabsir.([28])

## References

1. Khatib, Tarikh Baghdad, ii, 163; Yaqut, Mujam al-Udaba, xvii, 44.
2. Fihrist, pp. 326-328.
3. Wafayat al-Ayan, ii, 29-30.
4. Tarikh Baghdad, ii, 162-169.
5. Mu'jam al-Udaba, xviii, 40-95.
6. Tabaqat al-Shafiyat al-Kubra (Egypt) ii, 135-140.
7. Lisan al-Mizan, V, 100-103.
8. iv, 578, 579.
9. Nineth Edition, xxiii, 1-4.
10. Selections from the Annals of Tabari (Lieden, 1902) Introduction F. pp. x-xiii
11. Yaqut, xviii, 49-50.
12. Ibid
13. Yaqut, xvii, 50.
14. Ibid, p. 52.
15. Yaqut, xviii 56.
16. Ibid. vi, p. 424.
17. Yaqut
18. Tarikh-e-Baghdad ii, 163
19. Yaqut, xviii, 59
20. Encyclopaedia Britannica (Ninth Ed.) XXII, 3.
21. Ibid, p. 4
22. Lectures on Arabic Historians, p. III.
23. The Encyclopaedia of Islam, IV, 578.
24. Ibid, IV, 599.

[25]. Encyclopaedia Britannica, op, cit. p. 4.

[26]. Cf. Lectures, p. 102.

[27]. Cf. Encyclopaedia Britannica (Ninth Ed.) XXII, 4.

[28]. Cf. M. J. De Geoje, Selections from the Annals of Tabari (1902). Introduction F pp. x-xi

★★★★★

*Dr. Tahira Basharat

# The Legacy of Holy Prophet Muhammad (ﷺ) and its Impact on the Development of Islamic Civilization – A Historical Perspective

## Introduction

Prophet Muhammad (peace be upon him) holds a unique position in human history. Along with changing the Arabian Peninsula, his teachings and deeds had a substantial and enduring impact on the development of Islamic culture. Millions of people around the world have been impacted by the teachings and ideals of Prophet Muhammad (ﷺ), and his influence transcends all boundaries of religion. It is necessary to comprehend his contributions from a historical viewpoint in order to comprehend the roots of Islamic civilisation. This study article analyses the Prophet Muhammad's (ﷺ) substantial contributions to a range of domains, including sociocultural, political, intellectual, and scientific ones, in order to determine how they have impacted the development of Islamic civilization. This research tries to examine how the Prophet's teachings and deeds, which formed the basis of Islamic civilization, had a transformative effect. It accomplishes this by examining original historical sources, scholarly literature, and current accounts. A major focus of the Prophet's teachings was

* Professor & Chairperson, Department of Islamic Thought and Civilization, University of Management & Technology, Lahore

on guiding principles that addressed the moral, interpersonal, and spiritual dimensions of human existence. Justice, compassion, equality, and moral conduct served as the cornerstones of his teachings. By thoroughly researching historical details and inclusive social order, this study will shed light on how these principles influenced the implementation of societal reforms, ultimately leading to the establishment of a just society.([1])

The Prophet Muhammad (ﷺ) strongly supported acquiring knowledge and education. As a result, this study will also examine his contributions to the advancement of Islamic civilization's intellectual heritage. It will look into how the Prophet encouraged breakthroughs in fields like theology, philosophy, medicine, and mathematics by emphasising knowledge acquisition, critical thinking, and scientific inquiry. The Prophet set the stage for the quest of knowledge that became a distinguishing feature of Islamic civilisation by endorsing education as a path to enlightenment.[2] This study will also look at the Prophet's position as a political and administrative leader. It will examine his plan to bring together many tribes and build the first Islamic state in Medina. The study will examine the democratic tenets, consensus-based decision-making procedures, and egalitarian goals that characterised the political system put in place under his direction. The investigation will also focus on the Prophet's diplomatic abilities and interactions with other societies, emphasising his efforts to promote interfaith cooperation and settle disputes peacefully.

This research study seeks to shed light on the significant impact Prophet Muhammad (ﷺ) had on the advancement of Islamic civilisation by thoroughly examining both the historical setting and the Prophet's (ﷺ) teachings. It aims to show how his revolutionary ideas, principles, and deeds still influence Muslim countries and serve as an example to people all around the world. Appreciating the lasting relevance of his teachings in modern times requires an understanding of the historical significance of his influence. In summation, the goal of this research work is to advance our understanding of the Prophet Muhammad's (ﷺ) influence on the growth of Islamic culture. It tries to show the varied character of his influence and its lasting relevance by looking at his teachings, societal changes, intellectual contributions, and political leadership. The study has

consequences for academics, researchers, and those who are curious about understanding the historical roots and current applicability of Islamic civilization.

## Research Objectives

The goals of this study are to look at the teachings and deeds of Prophet Muhammad (ﷺ) and how they have affected the sociocultural aspects of Islamic civilization, to examine the major ideas he emphasised and how they have influenced cultural changes and promoted communal harmony within Islamic civilization, and to look at the contributions of Prophet Muhammad (ﷺ) to the intellectual growth of Islamic civilization in particular. It assesses Prophet Muhammad's (ﷺ) continuing influence on the development of Islamic civilization and its implications for contemporary society in order to draw lessons for promoting compassion, social justice, and ethical behaviour within Islamic society and to look at the significance of education and knowledge acquisition in the intellectual and scientific advancement of Islamic civilization under the guidance of the Prophet Muhammad.

## Methodology

The purpose of the paper is to assess the historical impact of Prophet Muhammad (ﷺ) on the growth of Islamic culture using a multifaceted methodology. It uses multidisciplinary approach to examine the various aspects of Islamic civilization. Prophet Muhammad's (ﷺ) influence is placed into the larger genuine, social, and socio-political context of Islamic history using similar and pertinent analysis. This research takes into account the historical evolution of Islamic societies, pre-Islamic Arabian society, and relations between the Islamic civilisation and other civilizations. Moral considerations are given significant weight throughout the assessment process, ensuring respect for rigorous sensibilities, social diversity, and analytical reliability. Analysing and interpreting the Prophet's teachings and deeds requires careful consideration of ethical norms. It is crucial to understand how the research's methods and sources have limitations. Consideration and discussion of potential biases in historical accounts, gaps in primary sources, and challenges in deciphering ancient

manuscripts encourage transparency and a nuanced understanding of the research findings. By using this thorough technique, the research study intends to add to the body of information already known in the field by offering a thorough examination of the Prophet Muhammad's (ﷺ) impact on the growth of Islamic culture.

## Data Analysis

### Socio-Cultural Impact

The teachings and deeds of Prophet Muhammad (ﷺ) had a significant sociocultural influence on Islamic civilisation. He posed a challenge to established societal norms and hierarchies with his emphasis on justice, equality, and compassion. The Prophet promoted a more equal society by fighting for the rights of the oppressed, such as women, slaves, and the underprivileged. His ethics, morality, and personal behaviour teachings have an impact on society by encouraging truthfulness, charity, and kindness. The development of Islamic ethics in regard to issues like family, marriage, and interpersonal interactions had a tremendous impact on the social structure of Islamic culture.([3])

### Women's Rights

The status and privileges of women in Islamic society were significantly improved by the Prophet Muhammad (ﷺ). Women in pre-Islamic Arabia endured tremendous discrimination and had few social and legal rights prior to his teachings. The Prophet emphasised that men and women are equal before God in terms of their rights and obligations. He gave women the freedom to run their own businesses, inherit riches, own land, and pursue higher education.([4]) The Qur'an, the central religious text of Islam, contains verses that emphasize the dignity and equal worth of both genders.

It has been said in the Holy Quran:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا ٱكْتَسَبُواْۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا ٱكْتَسَبْنَۚ

Men will be rewarded according to their deeds and women equally according to theirs([5])

Treatment of Slaves: The Prophet Muhammad (ﷺ) fought for

the freedom of slaves and supported their humane treatment. He underlined the importance of freeing slaves while actively taking part in the manumission of slaves. The Prophet's teachings provided guidelines for how to treat slaves morally, including treating them equitably, providing them with adequate food, clothing, and shelter, as well as giving them the opportunity to become free. Imam Bukhari narrated:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم " مَنْ كَانَتْ لَهُ جَارِيَةٌ فَعَالَهَا، فَأَحْسَنَ إِلَيْهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا، كَانَ لَهُ أَجْرَانِ ".

> Allah's Messenger (ﷺ) said, "He who has a slave-girl and educates and treats her nicely and then manumits and marries her, will get a double reward."([6])

These concepts led to the eventual abolition of slavery within Islamic culture throughout time.

**Social Justice and Economic Equality**

In Islamic culture, the teachings of the Prophet advocated for economic equality and social justice. He emphasized that Muslims have a responsibility to assist the less fortunate through charitable endeavors and community support. As it has been said in the Holy Quran

And act justly. Indeed, Allah loves those who act justly. ([7])

Zakat, or obligatory almsgiving, was created to alleviate poverty and share wealth. The Prophet encouraged Muslims to impart their abundance to those deprived to cultivate a feeling of local area and solidarity. Islamic society saw a reduction in inequalities and a more equitable distribution of resources as a result of this emphasis on economic equality.([8])

**Ethical Conduct and Morality**

The Prophet Muhammad (ﷺ) exemplified and taught strong moral standards, inspiring honesty, integrity, and ethical behaviour within Islamic civilization. The principles of justice, dependability, and integrity were very important to him. Muslims might take a cue from the Prophet's personality and conduct. His moral and ethical teachings encouraged a culture of esteem, concern, and compassion for one another, which contributed to the

development of the Islamic civilization's social framework.([9])

**Principles and Values**

The study emphasises the fundamental ideas that the Prophet Muhammad (ﷺ) emphasised and which led social reforms and promoted intergroup harmony. Tawheed (monotheism), unity, justice, mercy, and empathy are some of these ideals. The concept of God's unity served as the cornerstone of Islamic culture, uniting various ethnic groups under the banner of Islam. A just society where people's rights were upheld and compassion was practised was made possible by the Prophet's emphasis on justice and kindness. The moral compass of Islamic civilisation is based on these tenets, which still serve as a guidance for Muslims today.

Tawheed, or the idea that there is only one God, is a fundamental tenet of Islam and the basis of Islamic culture. The Qur'an emphasizes the unity of God, stating, "Say: He is Allah, the One; Allah, the Eternal, Absolute; He begetteth not, nor is He begotten, and there is none like unto Him" (Qur'an, Surah Al-Ikhlas, 112:1-4). This principle unifies Muslims and establishes a common belief system that transcends cultural and ethnic differences.

Justice is another core principle emphasized by Prophet Muhammad (ﷺ). The Prophet advocated for the establishment of a just social order where individuals' rights were protected and where fairness prevailed. The Qur'an states:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُونُواْ قَوَّٰمِينَ بِٱلْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ أَوِ ٱلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ ۚ

O you who have believed, be persistently standing firm in justice, witnesses for Allah, even if it be against yourselves or parents and relatives.([10])

This principle of justice ensured equality before the law and served as a guiding principle for the legal and judicial systems within Islamic civilization.

The Prophet embodied mercy and compassion in both his words and deeds. The Prophet taught Muslims to exhibit mercy towards all of creation by modelling it. The Qur'an calls Prophet Muhammad (ﷺ)

وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَٰلَمِينَ

We have sent you  O Prophet  only as a mercy for the whole world.(11)

This mercy principle encompasses all aspects of human connection, including social interactions and acts of kindness. It encourages empathy and advances a compassionate and caring society. These values, which are based on the teachings of the Prophet Muhammad (ﷺ), continue to direct Muslims today and serve as the Islamic civilization's moral compass. They influence how people behave, how they connect with one another, and how they approach public affairs and governance. Muslims strive to uphold justice, promote unity, show mercy, and practice empathy in their daily lives, drawing inspiration from the Prophet's teachings and his example.(12)

**Intellectual Contributions**

In the intellectual advancement of Islamic culture, the Prophet Muhammad (ﷺ) was crucial. His support for learning and information acquisition resulted in important improvements across several areas. Islamic scholars and researchers added to the theological, philosophical, medical, and mathematical foundations established by the Prophet. The importance of learning and research in Islamic civilisation made it easier for the translation and preservation of Greek, Persian, and Indian writings during the Islamic Golden Age. Numerous hadiths (sayings) attributed to the Prophet serve as examples of how important the Prophet thought the pursuit of knowledge was. For instance, according to the Prophet (Miskhat)

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ

Seeking knowledge is obligatory upon every Muslim.(13)

This emphasis on information acquisition gave Muslims the motivation to engage in scholastic activities and intellectual pursuits.(14) By fusing Islamic doctrine with Greek philosophy and creating complex theological and philosophical frameworks, Islamic thinkers made substantial contributions to theology and philosophy. Important thinkers like Al-Farabi, Ibn Sina (Avicenna), and Ibn Rushd (Averroes) contributed significantly to the expansion and preservation of the intellectual legacy of Islamic

culture. Muslim doctors like Al-Razi (Rhazes) and Ibn Sina made revolutionary advances in the medical sector. Their contributions to medical diagnosis, therapy, and pharmacology not only affected medical practise inside Islamic civilization but also had a long-lasting influence on the advancement of medicine throughout the world.

Islamic mathematicians made contributions as well, particularly in the areas of algebra and trigonometry. Algebraic equations and trigonometric functions were significantly advanced by scholars like Al-Khwarizmi and Al-Biruni, who also introduced ideas and techniques that are still in use today. The Islamic Golden Age played a crucial role in the exchange of information between cultures through the translation and preservation of Greek, Persian, and Indian books. Through translation, prominent ancient philosophers, scientists, and mathematicians' works were preserved by Islamic scholars. These deciphered books were a fundamental asset for scientists and made a huge commitment to the development of insightful exercises inside Islamic human progress.([15])

**Diplomacy and Interfaith Dialogue**

The Treaty of Hudaybiyyah, which made peace between the Muslims of Medina and the Quraysh tribe of Mecca, is one good example. The Prophet's political and interreligious systems formed the tranquil concurrence of Islamic culture with various strict networks, upgrading the social variety and scholarly trade in the Islamic world. With the help of his brilliant discretionary abilities, Prophet Muhammad (PBUH) participated in exchange with neighboring social orders and assisted with settling clashes. His interactions with Christians and Jews established a framework for interreligious dialogue that promoted understanding and tolerance. His partnerships with various tribes and communities are a great example of the Prophet's diplomatic efforts during his lifetime. Notwithstanding the underlying pressures and conflicts, the Prophet successfully arranged the conditions of the settlement, bringing about a very long term time of quiet and allowing tranquil connections among Muslims and Meccans.([16])

The Prophet Muhammad (PBUH) interacted with Jewish and Christian communities to foster tolerance and understanding. His relationships with Jewish tribes like the Banu Nadir and Banu

Qurayza in Medina demonstrate his dedication to promoting religious tolerance and harmonious coexistence. The Prophet actively sought diplomatic settlements to conflicts and conversed to foster understanding. These interactions set a precedent for following generations in terms of encouraging interfaith dialogue and developing religious harmony within Islamic civilization. The Prophet's guiding principles in his diplomacy and interfaith conversations were justice, respect, and understanding of one another. Regardless of one's religious orientation, he emphasised the importance of treating everyone with fairness and kindness. The Qur'an states in Surah Al-Mumtahanah, verse 60:8, that Allah "does not forbid you from those who do not fight you because of religion and do not drive you from your homes - from being righteous towards them and acting justly towards them." This verse provides as an illustration of the Prophet's commitment to respectful interactions and peaceful coexistence with people of various religions.

The Prophet's interfaith dialogue and diplomatic endeavours have greatly benefited the Islamic world's cultural variety and intellectual connection. The fostering of diplomatic links and peaceful cooperation with adjacent societies made it easier to exchange cultural norms and other types of knowledge. Intellectuals and professionals from various theological backgrounds helped Islamic culture flourish and turn it into a centre of knowledge, science, and innovation.([17])

**Enduring Relevance**

The results of the study show the continuous significance of the Prophet Muhammad's (PBUH) contribution to the development of Islamic culture. His example and ideas continue to inspire Muslims all around the world, guiding their actions in terms of personal relationships, social interactions, and civic participation. The Prophet's teachings on justice, compassion, and ethical behaviour are still essential for resolving contemporary problems and advancing a just and peaceful society. The Prophet's impact continues to be relevant, which serves as motivation for Muslims who are seeking to navigate the difficulties of the modern world.

On the personal lives of Muslims, the teachings and deeds of the Prophet Muhammad have had a profound impression. Muslims

can use his emphasis on morality, honesty, and humility as a guide in their daily life. In a society where moral conundrums and difficulties abound, the Prophet's lessons on honesty, forgiveness, and empathy still strike a chord with those trying to follow moral principles. The Prophet's teachings encourage inclusivity, kindness, and respect for others in interpersonal interactions. Muslims still adhere to the Prophet's example of treating everyone equally and with respect, irrespective of their socioeconomic standing, nationality, or religion. His guidelines for upholding harmonious relationships, resolving disputes, and advancing justice serve as a model for creating cohesive and welcoming communities.([18])

Another facet of the Prophet's ongoing relevance is our engagement in civic affairs under the guidance of his teachings. Muslims are motivated to actively participate in issues of governance, advocacy, and social justice by the Prophet's emphasis on justice and accountability. As the Prophet did in his day, Muslims are urged to support good government, try to reduce poverty and inequality, and fight for the rights of the marginalised. The Prophet's impact is still relevant today in addressing issues of the present. His teachings offer Muslims direction in resolving problems like religious diversity, gender equality, environmental protection, and social justice. To address these issues and advance a more just and peaceful society, Muslims today rely on the values and principles espoused by the Prophet.

## Conclusion

The study of the Prophet Muhammad's (PBUH) impact on the growth of Islamic culture offers important new understandings of the deep influence he had on many facets of society. The Prophet's teachings and deeds continue to influence Muslim lives and the course of Islamic civilisation, from sociocultural transformation to intellectual contributions, diplomacy, and interfaith engagement. By challenging traditional norms and hierarchies, the Prophet's emphasis on justice, equality, and compassion helped to create a more equitable society. His ethical and moral beliefs impacted society by encouraging truthfulness, charity, and kindness. The development of Islamic ethics in regard to issues like family, marriage, and interpersonal interactions had a tremendous impact on the social structure of Islamic culture.

The Prophet made enormous intellectual contributions through promoting learning and information acquisition, which resulted in numerous fields seeing tremendous advancements. Building on the principles established by the Prophet, Islamic academics and scientists made contributions to the fields of religion, philosophy, medicine, mathematics, and the translation and preservation of antiquity. Islamic culture entered a golden age of intellectual and scientific advancements as a result of the significance it placed on study and knowledge. The Prophet's diplomatic abilities and participation in interfaith discourse established a standard for harmonious relationships and dispute resolution. His relationships with the Jewish and Christian populations promoted tolerance, respect, and harmonious coexistence. These diplomatic and interreligious dialogue tenets significantly influenced the development of Islamic civilization's cultural diversity and intellectual interaction.

The Prophet's influence continues to have an impact on Muslims' lives to this day. His teachings continue to motivate people, directing their private lives, social connections, and involvement in public events. In order to confront modern issues and advance a just and peaceful society, the values of justice, compassion, and ethical behaviour continue to be crucial. In conclusion, it is obvious that the Prophet Muhammad (PBUH) had an impact on Islamic civilisation. His ideas and deeds have had a long-lasting impact, influencing Islamic civilization's social, intellectual, and cultural facets. Muslims still look to his teachings for direction in both their personal and communal lives, finding inspiration in his values of fairness, compassion, and moral behaviour. For Muslims attempting to negotiate the complexity of the contemporary world while keeping the ideals and principles that he demonstrated, the Prophet's continuing relevance serves as a source of inspiration. Our understanding of the Prophet Muhammad's (PBUH) tremendous influence on the development of Islamic culture grows as we dig deeper into the study of his life and teachings. Muslims all across the world continue to honour, study, and adore his legacy, which has aided in the development and advancement of Islamic thinking and practise.

## References


[1]. Islam, Muhammad Hifdil. Islam and Civilization (Analysis Study on the History of Civilization in Islam). Al-Insyiroh: Jurnal Studi Keislaman 5, no. 1 (2019): 22-39.

[2]. Mersepasi, Naser. The role of education in the formation and promotion of the organizational civilization. The Journal of Productivity Management 2, no. 2 (5) (2008): 7-20.

[3]. Syed, Ali Furqan, Muhammad Junaid, and Shahnawaz Shahid. Analyzing the Farewell Sermon of the Prophet Muhammad (PBUH) A Critical Perspective. International Journal of Linguistics Studies 1, no. 1 (2021): 71-81.

[4]. Shabir, Ghulam, and Ghulam Safdar. Human Rights and Women’s Rights in Islam. (2014): 114-126.

[5]. https://quran.com/en/an-nisa/32

[6]. USC-MSA web (English) reference: Sahih al-Bukhari: Vol. 3, Book 46, Hadith 720

[7]. Al-Hujurat 49:9

[8]. Channa, Shahzado, and Hadi Bux. Social Justice in Islam: Some Glimpses from the Life of the Prophet Muhammad (Peace be upon him). Zia e Tahqeeq 11, no. 22 (2021): 1-12.

[9]. Hashi, Abdurezak Abdulahi. Islamic ethics: An outline of its principles and scope. Revelation and Science 1, no. 03 (2011).

[10]. Qur'an, Surah An-Nisa, 4:135

[11]. Qur'an, Surah Al Anbiya, 21:107

[12]. Mirzal, Husnul, and Sri Yayu Ninglasari. Situational Leadership in Islam: An Analysis of the Leadership Model of the Prophet Muhammad. Dialogia 19, no. 1 (2021): 163-190.

[13]. https://www.al-hadees.com/hadees-details/mishkat/218

[14]. Sayyid, Salman. Islam and knowledge. Theory, Culture & Society 23, no. 2-3 (2006): 177-179.

[15]. Shah, Bilal R. Contribution of Muslim Scholars towards Modern Science. Impact of Science on Society 26, no. 3: 161-167.

[16]. Alam, Mohammad Shekaib. Islam and Diplomacy: The Quest for Human Seicurity. Journal of Islamic World and Politics 3, no. 1 (2019): 559-563.

[17]. Khan, Issa, Mohammad Elius, Mohd Roslan Mohd Nor, Mohd Yakub zulkifli Bin Mohd yusoff, Kamaruzaman Noordin, and Fadillah Mansor. A critical appraisal of interreligious dialogue in Islam. Sage Open 10, no. 4 (2020): 2158244020970560.

[18]. Masitah, Widya. Morality in Islam. In Proceeding International Seminar of Islamic Studies, vol. 1, no. 1, pp. 914-922. 2020.

★★★★★

# ادارہ علومِ اسلامیہ کی اساتذہ محترم کی تالیفات

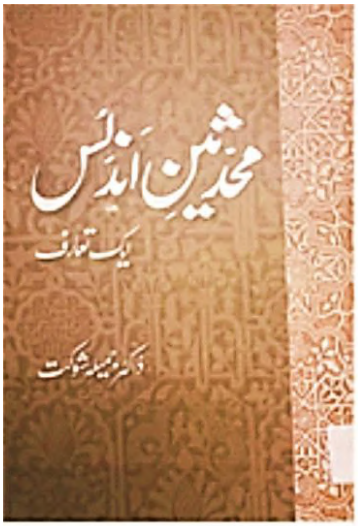

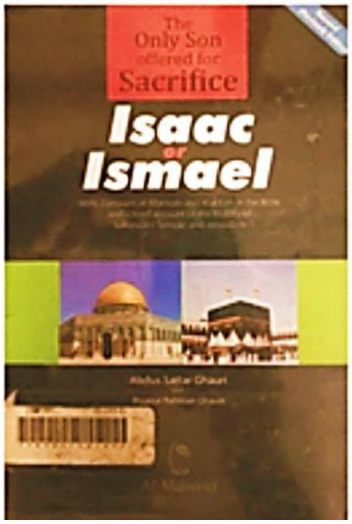

*Salman Ahmad Khan Zaighum
**Gulzar Ahmad

# Managers' Responsibilities in Stress Prevention at Workplace: An Islamic Perspective

## Introduction

Stress at workplace has been identified as one of the major cause of physical ailments and psychological disorders amongst employees, and it is associated with an elevated risk of type 2 diabetes and cardiovascular (CV) illness (Crawford, 2019), changes in brain functional activity, post traumatic stress disorder (PTSD) and Cushing's disease (McEwen, et al., 2015). Stress at workplace causes frustration and feeling of inefficiency, reduced job satisfaction, lack of concentration at work and lessens decision making ability resulting into lower performance (Islam et al., 2019). The most alarming outcome of the "failure of acute stress-response system" appears in shape of suicidal attitude (Miller, 2019).

While many scholars have devoted themselves to find the remedies of stress at workplace in the light of Islamic teachings (Abbasi, 2015; Achour, et al., 2016; Amilin, 2016; Asadzandi, 2019; Bahari, 2018; Benedictus, 2018; Hassan, et al., 2018) yet

* MSBA scholar at Lahore Garrison University, Pakistan
** Professor and Head of Psychology Dept at Lahore Garrison University, Pakistan

there is scarcity of literature spotlighting exclusively on managerial obligations to deal with this contemporary workplace issue in Islamic perspective. To address this gap, this study is an endeavor to explore the responsibilities of managers in stress prevention at modern day workplace in the light of Islamic teachings. This is a theoretical research (APA, 2010, p.10) based on the immense source of knowledge and wisdom offered by the Holy Qur'ān, Sunnāh and Islamic history, and particularly focuses on fixing the managers' responsibilities in stress prevention at the workplace.

**Stress at Workplace**

World Health Organization described that stress at workplace is the way individuals may react to the excessive work demands and burden, not compatible with their intellectual capacity and capability which aggravates in conditions of deficient organizational support and poor job autonomy (WHO, 2019).

**Causes of Stress at Workplace**

Scholars have identified certain causes of stress at workplace also known as the stressors and defined as situation of threat of constant victimization, challenge, burden or organizational restrictions confronted by the individual (Wheaton, 2010). The common stressors in literature are summarized in tabulated form as under:

**Common Workplace Stressors**

| Workplace Stressor | Description | Psychosocial & Physiological Effects | Reference |
|---|---|---|---|
| Workplace bullying & maltreatment | Violent behavior of managers like shouting, abusing, aggressive emails and maltreatment of subordinates. A person may undergo stress especially when he/she assumes a danger to his social respect. | Lower self-worth<br>Lower self-esteem<br>Lower self-respect<br>Post-traumatic stress<br>Job burnout<br>Increased intentions to leave<br>Reduced job satisfaction<br>Reduced organizational commitment<br>Depression<br>Higher risk of type 2 Diabetes & | Crawford, 2019; Nielsen, 2012; Sohail, 2015; Stich, 2019; Verkuil, 2015 |

| Workplace Stressor | Description | Psychosocial & Physiological Effects | Reference |
|---|---|---|---|
| | | cardiovascular disease | |
| Organizational injustice | The extent to which employees perceive workplace procedures, interactions and outcomes to be fair in nature. Includes effort-reward balance. | Lower esteem<br>Job insecurity<br>State of distress<br>Fear of career smash up | Elovainio, 2002; Probst, 2005 |
| Discrimination | Discrimination at workplace due to gender, caste, ethnic, linguistic basis leads to stress as the discriminated person feels that he/she has been wronged and deprived of the basic right. | Increased absenteeism<br>Reduced productivity<br>Increased turnover<br>Threat to mental health | Thrasher, et al., 2015 |
| Unsupportive work relationships | Poor leadership and interpersonal relations between supervisors and workers. | Increased absenteeism<br>Decreased performance<br>Increased rate of accidents<br>Likelihood of looking for alternative employment | Kelloway, 2005 |
| Work overload | Work pressure to meet deadlines, lengthy work hours, work on holidays and understaffed workplace. | Frustration<br>Feeling of inefficiency<br>Decreased satisfaction<br>Lack of concentration<br>Decreased decision making ability | Islam, et al., 2019 |
| Financial stress | Financial crisis caused due to rise in unemployment, staff reduction and wages reduction. | Increased rate of mood disorders<br>Anxiety<br>Depression<br>Suicidal attitude | Mucci, 2016 |

## Islamic Perspective on Managerial Responsibilities for Stress Prevention

Islam teachings encompass every aspect of human life in a befitting manner, educating and guiding the mankind in remarkably rational way to the path of success. Holy Qur'ān and Sunnāh clearly lay down the obligations of persons who are given

authority and make them accountable for the wellbeing of people for whom they have been made responsible. Major themes emerging from the content analysis in the context of managerial responsibilities for stress prevention at workplace are discussed below:

**Managers as Guardians**

Guardianship is the fundamental principle in communal relationships in an Islamic society and it also encompasses manager-worker relationship. It is explicitly expressed in Islamic teachings. The Holy Qur'ān says:

"And (as for) the believing men and the believing women, they are guardians of each other; they enjoin good and forbid evil and keep up prayer and pay the poor-rate, and obey Allah and His Messenger; (as for) these, Allah will show mercy to them; surely Allah is Mighty, Wise" (Al-Qur'ān 9:71).

Prophet Muhammad (Peace and blessings of Allah be upon him) has made this code of conduct unambiguous in following ahadīth:

Narrated by Abdullah bin Umar, the Prophet [pbuh] said, "Every one of you is a guardian and every one of you is responsible (for his wards). A ruler is a guardian and is responsible (for his subjects); a man is a guardian of his family….. Beware! All of you are guardians and are responsible (for your wards)" (Sahih al-Bukhari, Vol. 7, Book 62, *hadīth*: 116);

"Indeed each of you is a shepherd and all of you will be questioned regarding your flock" (Jami` at-Tirmidhi, Book 23, *hadīth*: 36);

"Whoever has a brother under his command should feed him of what he eats and dress him of what he wears. Do not ask him to do things beyond his capacity and if you do so, then help him" (Sahih al-Bukhari, Vol. 1, Book 2, *hadīth*: 29).

Likewise, managers are not exclusively responsible to earn profit for the organization. They are equally responsible for their employees' wellbeing. Holy Prophet [pbuh] said:

"Profit follows responsibility" (Sunan Abi Dawud, Book 24, *hadīth*: 93) and "Start charity with those for whom you have been

made responsible" (Sunan an-Nasa'i, Book 23, *hadīth*: 2544).

Second righteous Caliph Umar bin Al-Khattab (May Allah be pleased with him), strictly followed the accountability process for his governors and deputies and used to inquire from the public to assess their conscientiousness. He would ask them, "whether he visits the ill persons, does he pay attention to the slaves' wellness and how do he take care of the disenfranchised?" and if the response to one of these queries was negative, Umar would dismiss him from the post (Naumani, 1962).

It is argued that, if managers start acting as guardians of their workers they will always remain concerned about their physical and mental health, any complicatedness in personal or professional matters, wellbeing, work load and above all will endeavor to create a supportive culture. This will definitely pave way to a stress-free workplace.

**Justice**

Almighty Allah commands humankind to establish justice. Following verses emphasize the importance of creating justice. Holy Qur'ān says:

"Allah does command you to render back your Trusts to those to whom they are due; and when you judge between people that you judge with justice. Verily how excellent is the teaching, which He gives you! For Allah is He Who hears and sees all things" (Al-Qur'ān, 4:58);

"O you who believe! Stand out firmly for justice, as witnesses to fair dealing, and let not the hatred of others to you make you swerve to wrong and depart from justice. Be just: that is next to piety. And fear Allah for Allah is well-acquainted with all that you do" (Al-Qur'ān, 5:8).

Narrated by Abu Huraira, the Prophet [pbuh] said:

"Allah says that on the Day of Judgment, I will be against the person one who employs a laborer and gets the full work done by him but does not pay him his wages " (Sahih Bukhari, Vol.3, Book 34, *hadīth* :430).

A Bedouin came and asked the Prophet [pbuh], "When would the Hour (Doomsday) take place?" He said, "When honesty is lost,

then wait for the Hour (Doomsday)." The Bedouin said, "How will that be lost?" The Prophet said, "When the power or authority comes in the hands of unfit persons, then wait for the Hour (Doomsday)" (Sahih Bukhari, Vol.1, Book 3, *hadīth: 56*).

It is evident that if managers struggle sincerely to establish justice at the workplace, the workers would be satisfied with the organization and it will help them to remain stress free.

**Indiscrimination**

Islam's universal message of human equality prohibits indiscrimination. The Holy Qur'ān says:

"O mankind, indeed We have created you from male and female and made you peoples and tribes that you may know one another. Indeed, the most noble of you in the sight of Allah is the most righteous of you. Indeed, Allah is Knowing and Acquainted" (Al-Qur'ān, 49:13).

Address of the Holy Prophet's [pbuh] at the occasion of the Farewell Pilgrimage (Hajjat-ul-Wid'a) is clear manifestation of zero tolerance over discrimination. He said:

"All mankind is from Adam and Eve. An Arab has no superiority over a non-Arab, nor does a non-Arab have any superiority over an Arab; a white has no superiority over a black, nor does a black have any superiority over a white; except by piety (Taqwa) and good action" (Abdullah, 2007).

If managers fail to protect discrimination at workplace, it creates sense of deprivation and denial of rights amongst the organizational members, thus leading to a state of distress. Therefore, managers have their obligation to watch out any sign of discrimination and remove it there and then.

**Mutual Respect**

Islam does not allow anyone to make fun of others and forbids defaming and insulting others by using nicknames. In Sura Al-Hujurat, Almighty Allah says:

"O you who have believed, let not a people ridicule [another] people; perhaps they may be better than them; nor let women ridicule [other] women; perhaps they may be better than them. And do not insult one another and do not call each other by

[offensive] nicknames. Wretched is the name of disobedience after [one's] faith. And whoever does not repent - then it is those who are the wrongdoers" (Al-Qur'ān, 49:11);

O you who have believed, avoid much [negative] assumption. Indeed, some assumption is sin. And do not spy or backbite each other. Would one of you like to eat the flesh of his brother when dead? You would detest it. And fear Allah; indeed, Allah is Accepting of repentance and Merciful" (Al-Qur'ān, 49:12).

"He is not one of us who does not have mercy upon our young, respect our elders, and command good and forbid evil" (Jami` at-Tirmidhi, Book 27, Hadith 27).

**Consultation**

Consultation or *"Shura"* has been the hallmark of Islamic society and it was the tradition of the Holy Prophet [pbuh] to consult and involve people in decision making process. (Rehan, et al. 2019; Whyte, 2019). This participation thus ensured people empowerment on one hand and quality decisions on the other hand. The Holy Qur'ān says:

"Those who listen and pay attention to their Lord, and establish regular Prayer; who (conduct) their affairs by mutual Consultation; who spend out of what We bestow on them for Sustenance" (Al-Qur'ān, 42:38).

The principle of consultation in an organization strengthens the sense of belonging, self-esteem, self-worth, self-importance, self-confidence and self recognition amongst its members, thus addressing some common causes of stress at the workplace.

**Brotherhood**

Islam presents a concept of universal brotherhood. In Surah Al-Hujrat, Almighty Allah says:

"The believers are but brothers, so make settlement between your brothers. And fear Allah that you may receive mercy" (Al-Qur'ān, 49:12).

At the occasion of the Farewell Pilgrimage (Hajjat-ul-Wid'a), the holy Prophet [pbuh] said:

"Learn that every Muslim is a brother to every Muslim and that the Muslims constitute one brotherhood. Nothing shall be legitimate to a Muslim which belongs to a fellow Muslim unless it was given freely and willingly. Do not, therefore, do injustice to

yourselves" (Abdullah, 2007).

Following ahadīth of the Holy Prophet [pbuh] emphasize the spirit of brotherhood amongst the believers:

"None of you will have faith till he likes for his brother what he likes for himself." (Sahih Bukhari, Vol. 1, Book 2, *hadīth*: 13);

"Every good is charity. Indeed among the good is to meet your brother with a smiling face, and to pour what is left in your bucket into the vessel of your brother" (Jami` at-Tirmidhi Book 27, *hadīth*: 76);

"Neither nurture mutual hatred, nor jealousy, nor enmity, and become as fellow brothers and servants of Allah. It is not lawful for a Muslim that he should keep his relations estranged with his brother beyond three days" (Sahih Bukhari, Vol. 8, Book 73, *hadīth:* 99; Sahih Muslim Book 45, *hadīth*: 26).

"A Muslim is a brother of another Muslim. So he should neither oppress him nor hand him over to an oppressor. And whoever fulfilled the needs of his brother, Allah will fulfill his needs" (Sahih Bukhari, Vol. 9, Book 85, *hadīth:* 83).

**Freedom of Expression**

Freedom of expression is another hallmark of the Islamic society. Second pious Caliph Umer (May Allah be pleased with him) was asked to justify the possession of an extra piece of cloth and he very patiently explained that it was the share of his son who further presented that to him so that he might complete his dress; and at other instance he took a strong notice of suppressing a 'Qibti' (native Egyptian) by the son of Egypt's governor admonishing him in these words:

"Men were born free by their mothers who are you to enslave them" (Naumani, 1962).

It is the moral obligation of the managers not to silent any voice, because it may lead to the feeling of oppression amongst workers and result into state of stress and depression.

**Prohibition of Maltreatment and Bullying**

Allah Almighty directs human beings not to speak arrogantly with each other and to keep their voice tone lower. In Surah Luqman, He says:

"And do not turn your cheek [in contempt] toward people and do not walk through the earth exultantly. Indeed, Allah does not like everyone self-deluded and boastful. And be moderate in your

pace and lower your voice; indeed, the most disagreeable of sounds is the voice of donkeys" (Al-Qur'ān 31: 18-19).

Holy Qur'ān has appreciates the gentle behavior of the Holy Prophet [pbuh], in these words:

"It is part of the Mercy of Allah that you deal gently with them. If you would have been severe or harsh-hearted, they would have broken away from you: so pass over (Their faults), and ask for (Allah's) forgiveness for them; and consult them in affairs (of moment). Then, when you have Taken a decision put your trust in Allah. For Allah loves those who put their trust (in Him)" (Al-Qur'ān 3:159).

Holy Prophet [pbuh] said:

"It is sufficient evil for a man to look down on his Muslim brother" (Sunan Ibn-e- Majah Book 37, Hadith 4353) and "A Muslim's fighting his brother is disbelief, and verbally abusing him is disobedience" (Jami` at-Tirmidhi Book 40, Hadith 29).

It is manifested that showing anger, wrath and abusing are strictly prohibited in Islam. Managers are therefore, under obligation to embed culture of kindness in the organizations, where no one is able to bully or maltreat others. In this way they will protect their workforce from a potential cause of stress at the workplace.

**Proposed Model: Managers' Responsibilities for Stress Prevention at Workplace**

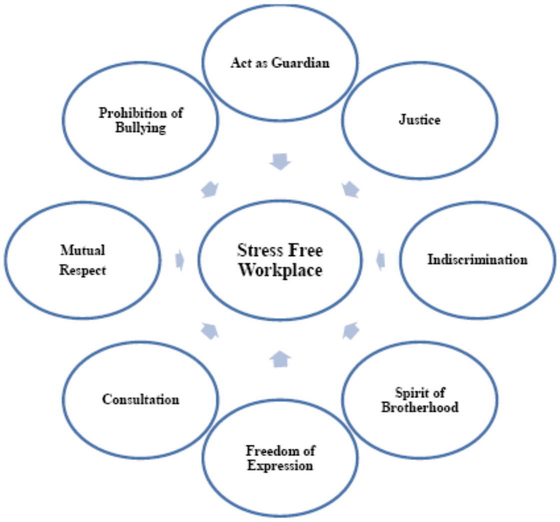

## Conclusion and Recommendations

Stress at workplace is disastrous for the individuals as well as the organizations. Islamic teachings are so comprehensive that it would be very logical to find the remedy of this predicament situation faced by the organizations in the light of Islamic wisdom and its deeply rooted traditions. The proposed model of managers' responsibilities for stress prevention at workplace is a realistic and balanced approach to deal with this contemporary issue because it addresses the psychosocial & physical causes of the stress at workplace.

Managers must take care of their workers like guardians and put wholehearted efforts to create a workplace where people have deep concern for each other's worries, bonded in the spirit of brotherhood and mutual respect; where no one is discriminated on the basis of caste, creed, color, gender, beliefs, ethnic background or race; justice is done to everyone; all have freedom of expression and decisions are taken through mutual consultation so that everyone feels honored and empowered. The workplace blessed with these characteristics will definitely become stress free; therefore, we suggest that managers being responsible for their workforce must fulfill their obligations in this regard. By doing so they will get affection of the Creator, together with job fulfillment, elevated spirit and higher organizational performance.

## Notes

i All references from the Holy Qur'ān have been acquired from the English translation available at https://quran.com, http://corpus.quran.com and https://www.quranexplorer.com.

ii All references of the "Ahadīth" - sayings of the Holy Prophet Muhammad (Peace and blessings of Allah be upon him) have been retrieved from https://sunnah.com and http://sahih-bukhari.com.

**References**


Abbasi, T. F. (2015). Impact of Work Overload on Stress, Job Satisfaction and Turnover Intentions with Moderating Role of Islamic Work Ethics. *Management Studies and Economic Systems, 54(2518), 1-11.*

Abdullah, A. (2007). Prophet Muhammad's last sermon: a Final admonition. *Islamreligion.com*.

Achour, M., Bensaid, B., & Nor, M. R. B. M. (2016). An Islamic perspective on coping with life stressors. *Applied Research in Quality of Life*, *11*(3), 663-685.

Amilin, A. (2016). Could Islamic Work Ethics Reduce the Work Stress of Accountants and Minimize Their Intention to Quit. *International Journal of Economic Perspectives*, *10*(2), 311-320.

Asadzandi, M. (2019). Characteristics of Sound Heart Owners as Islamic Spiritual Health Indicators. *J Community Med Health Care, 4(1), 1032.*

Bahari, R., Alwi, M. N. M., Jahan, N., Ahmad, M. R., & Saiboon, I. M. (2017). The Development of Islamic Psychospiritual Therapy for Post Traumatic Stress Disorder: Translating Research into Practice. *J. Appl. Environ. Biol. Sci, 7(5S), 20-24.*

Benedictus, R. A. (2018). Occupational Stress and Coping Strategy Harmony between Scientific Theory and Islamic Teachings And Practice. *Manasa, 7(1), 51-61.*

Crawford, M. H. (2019). Workplace Violence, Bullying Associated With Cardiovascular Disease Risk. *Internal Medicine Alert*, *41*(13).

Elovainio, M., Kivimäki, M., & Vahtera, J. (2002). Organizational justice: evidence of a new psychosocial predictor of health. *American journal of public health, 92*(1), 105-108.

Hassan, S. M., Mir, U. R., & Hassan, S. S. (2015). Spirituality and workplace stress management. *Al-Adwa*, *44*, 30.

Islam, N., Haque, P., Mubasshir, A., Sadi, M., & Sakib, S. (2019). The Effect of Work Stress on the Performance of Readymade Garment Workers in Bangladesh. *Available at SSRN 3411193*.

Kelloway, E. K., & Day, A. L. (2005). Building healthy workplaces: what we know so far. *Canadian Journal of Behavioural Science/Revue canadienne des sciences du comportement*, *37*(4), 223.

McEwen, B. S., Gray, J. D., & Nasca, C. (2015). 60 years of neuroendocrinology: redefining neuroendocrinology: stress, sex and cognitive and emotional regulation. *Journal of endocrinology*, *226*(2), T67-T83.

Miller, A. B., & Prinstein, M. J. (2019). Adolescent suicide as a failure of acute stress-response systems. *Annual review of clinical psychology*.

Mucci, N., Giorgi, G., Roncaioli, M., Perez, J. F., & Arcangeli, G. (2016). The correlation between stress and economic crisis: a systematic review. *Neuropsychiatric disease and treatment, 12, 983.*

Nielsen, M. B., & Einarsen, S. (2012). Outcomes of exposure to workplace bullying: A meta-analytic review. *Work & Stress, 26(4), 309-332.*

Probst, T. M. (2005). Economic stressors In J. Barling, E. K. Kelloway, & M. R. Frone (Eds.), *Handbook of work stress. (pp. 267-298).*Thousand Oaks, CA: SAGE Publications.

Rehan, F., Block, J. H., & Fisch, C. (2019). Entrepreneurship in Islamic communities: How do Islamic values and Islamic practices influence entrepreneurship intentions?. *Journal of Enterprising Communities: People and Places in the Global Economy, Forthcoming.*

Sohail, M., & Rehman, C. A. (2015). Stress and Health at the Workplace-A Review of the Literature. *Journal of Business Studies Quarterly, 6(3), 94.*

Stich, J. F., Tarafdar, M., Stacey, P., & Cooper, S. C. (2019). Appraisal of email use as a source of workplace stress: a person-environment fit approach. *Journal of the Association for Information Systems, 20(2), 2.*

Thrasher, A. D., Wells, A. M., Spencer, S. M., Cofie, L., & Yen, I. H. (2016). Workplace discrimination is associated with alcohol abuse among ethnically diverse hospital staff.

*Workplace health & safety,* 64(5), 202-209.

Verkuil, B., Atasayi, S., & Molendijk, M. L. (2015). Workplace bullying and mental health: a meta-analysis on cross-sectional and longitudinal data. *PloS one, 10(8), e0135225.*

Wheaton, B., & Montazer, S. (2010). *Stressors, stress, and distress.* A handbook for the study of mental health: Social contexts, theories, and systems, 171-199.

Whyte, S. A. (2019). Advancing Shūrā: A Social Agent for Democratization. *Islam and Christian–Muslim Relations,* 1-18.

World Health Organization. (2019). *Occupational Health.* Retrieved from https://www.who.int/occupational_health/topics/stressatwp/en/. Accessed August 7, 2019.

★★★★★

# ARMUGHAN AMANULLAH KHAN

Compiled By

Prof. Dr. Jamila Shaukat
Prof. Dr. Shahida Parveen

Institute of Islamic Studies
University of the Punjab, Lahore.